عصمتِ آدم علیہ السلام
اور
ابلیس
ابطال نظریہ تخطئۃ الرسول ﷺ
و
پرویزی فتنہ احادیث
مصنف
ڈاکٹر ضیاد علی آقائی

نام کتاب	:	عصمتِ آدم علیہ السلام اور ابلیس
مصنف	:	ڈاکٹر بنیاد علی آقائی
پروف ریڈنگ	:	سید جہت علی نقوی
ناشر	:	مکتبہ فدک، لاہور، پاکستان
اشاعت	:	اوّل 14 اکتوبر 2020ء
تعداد	:	500

ملنے کا پتہ:

(1) مکتبۃ الرضا، 8 بیسمٹ، میاں مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

(2) حیدری کتب خانہ، دوکان نمبر 9، اندرون کربلا گامے شاہ، لاہور

(3) محفوظ بک ایجنسی، کراچی

(4) عباس بک ایجنسی، درگاہ حضرت عباسؑ، رستم نگر، لکھنؤ، انڈیا

انتساب

میرے والدین کے نام

حصہ اوّل

(الف) قرآن وحدیث (صفحہ 3 - 69)

(ب) عصمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (صفحہ 70 - 102)

حصہ دوم

عصمت آدم علیہ السلام (صفحہ 103 - 157)

حکمت۔تصوف، ابلیس اور توحید۔ اسماھم کی حقیقت۔شجرِ ممنوعہ۔

حصہ سوئم

پرویزی مسئلہ حدیث اور متعلقات (صفحہ 157 - 180)

پرویزی ''مقامِ حدیث'' پر تنقید۔قرآن اور حدیث کا تقابل۔نظریہ خودی کا استحکام اور تفویض۔قرآن اور راسخون فی العلم کی ضرورت۔افسانہ عبداللہ بن سبا۔اسلام اور مہدویت۔ نبی کی اتباع و اطاعت یا عشق؟۔ذاتی جدوجہد اور بلند شعوری۔ استدلال اور عقل۔خود پرستی یا شہادۃ نفس؟۔عبادت کی تین اقسام۔جن اور فرشتے۔ ابن سینا، فرشتے اور یورپ۔اُمت یا ریاست۔قلم نہ تلوار بلکہ حق معیار ہے۔اختلاف یا تصادم۔ اتحاد یا یکسانیت۔خلیفۂ خدا کا مطلب۔اختتام۔کتابیات۔

مقدمہ

فرد ہو یا قوم؛ ملت ہو یا کُل انسانیت: جب تک وہ اپنی تاریخ اور مذہب کی مقصود درست آگہی حاصل کر نہیں لیتے؛ جھوٹ، خودفریبی اور جہلیت کے اندھیرے ہی اُن کا مقدر بنے رہیں گے۔

ہماری اکثریت کا المیہ یہ ہے کہ وہ تاریخ کا مطالعہ گناہ؛ اور عقل کو عقیدے کے منافی گمان کرتی ہے۔ جبکہ عقل، عقیدہ اور تاریخ، مثلث کے سہ اضلاع کی مانند ہیں۔ دورِ حاضر کی آوارہ، سرمایہ دار اور اعلیٰ اقدار سے فارغ سوچ اتنی منتشر اور پراگندہ ہو چکی ہے کہ وہ صبر وتحمل سے یہ سمجھنے کے قابل ہی نہیں ہو رہی کہ عقیدے کا مطلب کوئی ''مفروضاتی عقیدت'' نہیں۔ عقیدہ تو عالمگیر احساس میں دائمی حکمت کے پیدا ہو جانے کا نام ہے۔ لیکن کیا کیا جائے جب عقل، عقیدے اور تاریخ میں تقسیم پیدا ہو جاتی ہے: اور مذہب کی تشریح، عقیدے کے نام پر، مفروضاتی عقیدت کے ہتھے چڑھ جائے۔ اب ہوگا یہ کہ حق کا شعور و آگہی اور ظلم کے خلاف عدل کا قیام، ناقابلِ معافی جرائم اور سنگین گناہ نظر آنے لگیں گے۔ ہر طرف استحصالی، دھوکے باز اور انسان کش طاقتیں ہی فروغ پائیں گی۔

میرا یہ کتاب لکھنے کا مقصد ہے کہ اسلام میں ''عقیدۂ نبوت'' کا کسی ایسی مفروضاتی عقیدت سے لینا دینا نہیں جو انبیاء علیہم السلام کی عصمتِ مطلقہ کے، اپنی عقلی فقدان میں منافی ہو؛ خواہ اسے کوئی ''نظریہ تخطیہ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' یا ''ترک اولیٰ'' میں متشکل کر کے پیش کرے۔ یہ حق شناسی اُس وقت تک امرِ محال ہے جب تک ہماری ''خودی'' اپنی

سربلندی کے نرگسی قیاس سے باہر نہیں نکل آتی۔ ''نظریہ خودی'' ہی وہ ابلیسی قیاس کی جڑ ہے جو قیامت تک نبوتی حقیقت کے معصوم ہونے کا منکر رہے گا۔ اس معروضی سچ کو غلام احمد پرویز نے سر محمد اقبال کے نقشِ قدم پر ''خودی کے استحکام'' میں اپنی کتاب ''ابلیس و آدم'' اور ''مقامِ حدیث'' کے اندر نہایت صفائی سے زندہ درگور کرنے کی کوشش کی۔

آج ہماری مسلمان اکثریت جن بیماریوں اور بحران سے دو چار ہے؛ اُن کا سدِّ باب تب تک ممکن نہیں، جب تک ہماری عقلی درستگی غیر نرگسی بنیادوں پر تجزیہ و تحلیل کر کے، دیرینہ مفروضاتی عقیدت کی بجائے، عصمت الانبیاء علیہم السلام کے عقیدے میں حق کی دائمی حکمت، تاریخ کی مقدس روشنی میں اچھی طرح جان کر اختیار نہیں کر لیتی۔

تجدیدِ وفا کے موسمِ اعزا، محرم سے چند ایام قبل، عید غدیر کا موقعہ تھا۔ مہمان خانے میں نہایت گراں قدر علمی شخصیات تشریف فرما تھیں۔ اس علمی فضا میں گفتگو کا موضوع ابن رُشد کا فلسفہ عقل اور مقامِ وحی تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں علم اور ایمان کے امتزاج کا احقاق کرنے میں سرگرم تھا۔ جبکہ پروفیسر اسرار علی بڑی خاموشی سے بیٹھے سب سماعت کر رہے تھے۔ آخر کار کافی دیر بعد آپ یوں گویا ہوئے: ''معزز دوستو! یہ جو آپ ابنِ رُشد کے سر پہ مفاہمتی سہرے چڑھا اور سجا رہے ہیں، اس کی کوئی دائمی و عالمگیری حقیقت نہیں، بلکہ مقامی اور وقتی حیثیت ہے۔ آپ یہ مت بھولیں کہ آپ کی گفتگو میں سارا استدلال زمینی وقت کے اردگرد طواف کرنے تک محدود ہے۔ اس کائنات میں لاگنت اوقات ہیں، جن میں ہر کوئی وقت مقامی، منفرد اور داخلی بھی ثابت ہوتا ہے۔ ان تمام بے شمار وقتوں کو ایک ''عالمگیر زمان'' نے اپنی تکوینی گرفت میں حصار کیا ہوا ہے۔ پھر آپ کیوں مقامی، وقتی، کسی دلیل کو تکوینی زمان پر قیاس کر کے وحی کی غیر معقول توجیہات کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟ بات زمان پر ختم نہیں ہوگئی۔ آپ نے جونہی زمان سے پیچھے قبل میں قدم ڈالا، آپ ''دھر'' کے بے پناہ بحر میں جا گریں گے۔ اگر بچ گئے تو ''سرمد'' کے صحرا میں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ وہ بھی ابدیت نہیں، جس کا کبھی ہر وقت میں زمان پر تو تھا۔ تو میرا مطلب بس یہ سمجھانا تھا کہ ابدیت سے آئی ہوئی وحی کو وقتی زمین کی سطح پر لا کھڑا کرنا، اس کی حتمی حقیقت کو جاننے کیلئے بالکل عقل مندی نہیں بلکہ جُہلِ مرکب اور قیاس آرائیاں ہیں۔ اس عقلی فقدان میں جہالت پڑھائی لکھائی کر کے عالمانہ طور پر ملبوس ہو کر صرف جہلیت کی نئی صورت ہی اختیار کرتی ہے۔ جہالت کا علاج تو ممکن ہے؛ لیکن یہ بدبخت جہلیت اپنے علمی قیاس میں مبتلا لاعلاج مرض ہی ثابت ہوگا''۔

اب جونہی پروفیسر اسرار علی کا کلام ختم ہوا، تو تنقید و تائید کی برق چمکنا شروع ہوگئی۔ کوئی اضافیت کے نظریے؛ کوئی برگساں کے دُورانیے؛ کوئی ہاکنگ کے دھماکے کو دفاع کر رہا تھا۔ تاہم بادلوں کی آواز کے بعد بارش ہو جانے پر جب بحث میں ٹھہراؤ آنے لگا؛ علمیت کی جھاگ بیٹھنے لگی؛ تو سوال کانٹ کے جدلیاتی تضادات پر بحث کی صورت میں یوں سامنے آیا کہ کیا عقل محدود ہے یا بے حد؟ دوسرا عقلِ انسانی کہاں تک وحی میں ہدایت کو بعد از ختمِ نبوت، بغیر حاضر و ناظر ہادی کے، اپنے اصل معنی میں جاننے کے اہل ہے؟

دریں اثناء گھر کے خادم نے نواب قزلباش خان کو مطلع کیا کہ ایک اجنبی نوجوان آپ سے ضروری ملاقات کا خواہاں تھا۔ اُس کو بلوایا گیا۔ نواب صاحب نے اُٹھ کر بڑی شفقت سے گلے لگایا۔ دونوں نے کوئی گفتگو مختصراً کی۔ جب اجنبی پیغام دے چکا تو اجازت کا طلبگار ہوا۔ لیکن نواب صاحب نے یہ کہہ کر روک لیا......

نواب قزلباش: آغا امداد علی! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کچھ ایام پہلے آپ کے ہاں مولوی حامد رضا اور پروفیسر امیر علی مدعو تھے۔ کیا یہ سچ ہے کہ آغا سیّد درویش بھی وہاں موجود تھے؟

آغا امداد علی: جی نواب صاحب، ایسا ہی ہے۔

نواب قزلباش: کاش! میں اُس نایاب محفل میں شرکت کر پاتا۔ لیکن قسمت کی بات ہے، میں کسی کام کے سلسلے میں بیرونِ ملک چند دنوں کیلئے گیا ہوا تھا۔ مجھے یہ بھی اطلاع ہے کہ ان کے درمیان ایک بحث و مناظرہ ہوا۔ کیا یہ سچ ہے؟

آغا امداد علی: جی ہاں، میں وہاں موجود تھا۔

نواب قزلباش: از راہِ کرم، آغا جانی! آپ ہمیں اُس گفتگو کے متعلق کچھ بتا سکتے ہیں؟ کیا موضوع تھا؟ خاص کر سیّد درویش کا مؤقف کیا تھا؟ مجھے اُن سے ملے عرصہ بیت

گیا ہے، لیکن میں اُن کے انداز اور صاف گو علمیت کا مداح ہوں۔ مجھے صد ہا افسوس ہے جو اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔

آغا امداد علی: یہ نہایت گراں قدر موضوع اور مکالمہ تھا۔ میں نے اسے نہ صرف یہ کہ ہمہ تن گوش ہو کر سُنا، بلکہ اپنے دماغ میں محفوظ کرنے کے بعد تقریباً اُسی طرح، اُن کی روانگی کے بعد رات بیٹھ کر قلمبند کر لیا۔ میرے دماغ میں وہ سارا منظر اور مناظرہ ابھی بھی تر و تازہ ہے۔

نواب قزلباش: آغا جانی! میری تمام اہلِ محفل کی طرف سے درخواست ہے کہ آپ ہمیں اُس انمول گفتگو سے مستفید ہونے کی سعادت عنایت کریں۔

تمام حضرات آغا امداد علی کی زبانی مکالمہ سماعت کرنے کیلئے بے چین ہو گئے۔ مولوی حامد رضا اور پروفیسری امیر علی جیسی علمی قد آور شخصیات کسی تعارف کی محتاج نہ تھیں، بلکہ مہمانوں میں بیٹھے کئی اُن کے گرویدہ تھے۔

تاہم سیّد درویش اپنی علمی فراست اور طنز و مزاح میں ضرب المثل سمجھے جاتے تھے۔ کچھ کا تو خیال تھا کہ بہلول دیوانے کی رُوح اُن میں بس گئی ہو۔ سبھی اس بحث میں علمی تصادم کی شدت، گہرائی اور نتائج جاننے کیلئے بے قرار تھے۔ اُن کے خیال میں ایک ہی بات تھی کہ سیّد درویش نے کیا کہا ہو گا!

اب آغا امداد علی نے بحث کا آغاز مولوی حامد رضا کی شروعیت سے کیا۔

مولوی حامد رضا: گذشتہ دنوں میں کسی غیر معروف مؤلف کا ایک مضمون، جس کا عنوان تھا: ''نبی علیہ السلام کا والد آزر نہیں ہوتا'' پڑھ رہا تھا۔ میں حیران ہو کر رہ گیا کہ اُس نے کس قدر جرأت سے انبیاء علیہم السلام کے آباؤ اجداد تک کو معصوم ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

سیّد درویش: اس میں آگ بگولہ ہونے والی کون سی بات ہے؟ کیوں مسجد کے

مولوی کی طرح اُس بے چارے گمنام کا نام روشن کر رہے ہو؟ کیا آپ کو اور کوئی پریشانی نہیں جو اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی؟

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب! یہ مذاق کا موقعہ نہیں، بلکہ علماء کیلئے لمحۂ فکریہ ہے۔

سیّد درویش: کیوں کیا ہوا؟

مولوی حامد رضا: دنیا کا کوئی بھی نظام ہو، وہ کسی خاص اُصول اور طریقے پر کاربند ہوتا ہے۔ اُس اُصول اور طریقے کی آگہی کے حصول واسطے باقاعدہ اور مناسب تعلیم و تربیت کے کٹھن مراحل سے گزرنا ناگزیر ضرورت ہے؛ تب کہیں جا کر کوئی اُس نظام کو چلانے یا اُس میں چلنے کے قابل ہو گا۔

سیّد درویش: مولوی صاحب اس میں کون سے الجبرے کی ضرورت ہے؟ لیکن علماء کہاں سے آ گئے، اور اُن کو کس وجہ سے فکر لاحق ہو گئی؟ اُس بے چارے مضمون نگار کا اس سے کیا تعلق نکلتا ہے؟ آپ کو کیسے اُس نے حیران کر دیا؟ میرا تو خیال ہے آپ کو اپنی حیرانگی سے لُطف اندوز ہونا چاہیے۔

مولوی حامد رضا: بھلا وہ کیوں؟

سیّد درویش: دیکھیں آپ خواہ مخواہ ڈنڈا لیے اُس کے پیچھے ہو گئے ہیں۔ حالانکہ لوگ کیا کیا جتن نہیں کرتے کہ بس وہ حیران ہو پائیں۔ دولت لوٹا دیتے ہیں، کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ ایسی چیز دیکھ، سُن یا پالیں کہ جو اُن کو بس حیران کر دے۔ دُنیا میں سات عجوبوں کا کیا یہ ہی معاملہ نہیں؟ آپ کو تو اُلٹا خوش ہونا چاہیے کہ گھر بیٹھے، ایک مضمون پڑھا کر اُس نیک بخت نے آپ کے چودہ طبق روشن کر دیئے۔

مولوی حامد رضا: آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

سیّد درویش: جی ٹھیک! آپ سمجھائیں، میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دُعا کیجئے گا کہ مجھے سمجھ آ جائے؛ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ خود، پتہ چلے، کہ بات کو سمجھے ہی نہ تھے۔

(سبھی ہنسنے لگے۔)

مولوی حامد رضا: میرا مقصد یہ تھا کہ دینی معاملات کو سمجھنے سمجھانے کیلئے مخصوص تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ دُنیاوی علوم کسب کرنے والا طالب علم جو فزکس، کیمسٹری اور میتھ پڑھتا ہو، اور رائے دینے کی کوشش کرے، کسی دینی معاملے میں عالمِ دین کی طرح؟ دُورِ جدید کا دینی المیہ یہ ہی ہے کہ یہ ماڈرن اصلاح پسند بنا حدیث وتفسیر، فقہ و کلام کی مدارسی تعلیم حاصل کیے ازخود مطالعہ کی بیساکھی لیے، نیٹ سے ٹوٹی پھوٹی مذہبی معلومات حاصل کر کے اپنی ذاتی آراء سے معاشرے میں، جو پہلے ہی اخلاقی طور پر سوکھا جنگل بنتا جا رہا ہے، فساد عام کر رہے ہیں۔ وہ علمائے دین کی جگہ اپنے بدعقیدوں میں بے جا آزادی کو متشکل کر کے، تعلیماتِ اسلام کی تباہ کن تاویلات کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔

سیّد درویش: تو کیا دینی علم جدید علوم کی جہالت سے مشروط ہے؟ آپ چاہتے ہیں کہ انٹرنیٹ کی دُنیا بھی ممنوع قرار دے دی جائے؟ اگر ایسا مان لیا گیا تو دینِ اسلام جو آپ جتلانا چاہ رہے ہیں، اُس میں مجھے جابر بن حیان، نہ بُوعلی سینا، نصیرالدین طوسی، نہ کوئی الکندی باقی دکھائی دیتا ہے۔

مولوی حامد رضا: میرا یہ ہرگز مطلب نہ تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ باقاعدہ دینی تعلیم سے گزرنا لازم ہے، دین کا فہم حاصل کرنے کیلئے۔

سیّد درویش: دینی تعلیم کا فہم مقصود ہے، یا پھر دینی تعلیم میں سے گزرنا ہے؟

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب آپ بات کو خواہ مخواہ کھینچ رہے ہیں۔ بے شک تعلیم حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اور اس کیلئے مدارسی تعلیم سے گزرنا پڑتا ہے۔

سیّد درویش: مطلب ''حاصل'' کرنے کیلئے ''گزرنا'' ہے۔ جو گزر گیا اُسے دینی فہم حاصل ہوگیا۔ بغیر گزرے حُصولِ علم ممکن نہیں۔ کیا آپ نے ابن طفیل کی کتاب ''حی

بن یقطان'' کا مطالعہ کیا ہے۔؟

مولوی حامد رضا: نہیں۔

سیّد درویش: یہ گزرنے اور حاصل کرنے والا معاملہ اُس نے بڑے احسن طور پر سمجھایا ہے۔ کاش مجھے اُس کی بات کا پتہ، سمجھ، شعور اور یقین نہ ہوتا تو شاید آپ کی بات سے اتفاق کا طوق اپنے گلے میں لٹکا دیتا۔ خیر چھوڑیئے اس بات کو اور یہ بتائیں کہ آپ حیران کیوں ہو گئے وہ مضمون پڑھ کر؟ بلکہ آپ نے تو مجھے بھی حیران کر دیا ہے۔

مولوی حامد رضا: آپ سیّد صاحب کیوں حیران ہیں؟

سیّد درویش: دیکھیں ساری عمر آپ کی گزر گئی مطالعہ کر کر کے، پڑھ پڑھ کے، لیکن کوئی دلیل، کوئی منطق، کوئی تاریخ آپ کو حیران نہ کر سکی: ماشاء اللہ ایسا مضبوط اور جامد نسل کا ایمان پایا ہے آپ نے۔ تو میں حیران یہ ہوں کہ اُس مضمون نے آپ کو حیرانی میں پگھلا کیسے دیا؟

مولوی حامد رضا: حیرت کی بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے آباؤ اجداد کو معصوم قرار دینے والا وہ شخص، جو ثابت کر رہا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد تارخ مؤحد تھے؛ قرآن کی واضح آیات کا کس قدر منکر ہے، جن میں آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک سبھی انبیاء علیہم السلام اپنی خطاؤں کی بارگاہِ رب العزت میں معافی مانگتے آئے ہیں۔

سیّد درویش: میں نے تو وہ حیران کن مضمون پڑھا نہیں، البتہ یہ جو آپ نے انبیاء کی معافی والا بیڑہ اُٹھایا ہوا ہے، اُس کا مجھے کچھ سر پیر پکڑا دیں تو مہربانی ہو گی۔ البتہ ایسے لگ رہا ہے کہ آپ کی علمی بہتات سے عصمتِ انبیاء علیہم السلام کوئی برداشت نہیں ہو پا رہی۔ آخر کیا وجہ ہے؟

مولوی حامد رضا: مذاق اپنی جگہ؛ لیکن آپ نے مسئلے کا بالکل دُرست ادراک

فرمایا ہے۔ بے شک یہ امر نہایت حساس، دقیق اور وسیع ہے۔ لیکن خدا کا لاکھ شکر ہے کہ شاہ ولی اللہؒ نے اسے نہایت ہی سہل اور ذود ہضم بنا دیا۔

سیّد درویش: اچھا جی! ذرا ہمیں بھی چکھائیں۔ (ہنس کر بولے)

مولوی حامد رضا: شاہ صاحبؒ اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں فرماتے ہیں کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے روایت کیا گیا ہے اور کتبِ احادیث میں اُس کی تدوین ہوئی، اُس کی دو قسمیں ہیں: (i) جو تبلیغِ رسالت سے متعلق ہے (ii) جو تبلیغِ رسالت سے غیر متعلقہ ہے۔

آگے چل کر یوں لکھتے ہیں کہ اوّل الذکر کے بارے میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی کہ ''پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو چیز تم کو دے اُس کو اختیار کر لو اور جس سے منع فرمائے اُس سے باز آؤ''۔ جبکہ آخر الذکر کی نسبت آپ کی حدیث ہے: ''جب میں اپنی رائے سے کسی بات کا حکم دوں تو میں صرف ایک آدمی ہوں''۔

اب اس دوسری قسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جو افعال صادر ہوئے وہ عادتاً تھے نہ کہ عبادتاً، اتفاقاً نہ قصداً۔

سیّد درویش: آپ کہنا چاہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیثیت مطلقہ نہیں، بلکہ منقسم ہے، بشری اور نبوتی میں۔

مولوی صاحب: جی ہاں! ایسا ہی ہے، آپ بالکل صحیح سمجھے۔

سیّد درویش: لو اب میری سمجھ میں آیا کہ کیوں آپ اُس مضمون نگار، گمنام پر گرم ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے آباؤ اجداد تو کجا، آپ خود اُن علیہم السلام کو بھی معصوم ماننے سے منع کرتے ہیں۔ آپ اکیلے نہیں بلکہ شاہ ولی اللہؒ جیسے نامور اور جیّد عالم کی سند کے حامل ہیں یہ ثابت کرنے کیلئے کہ نبی علیہ السلام اپنی بشری حیثیت میں ہمارے عام انسانوں کی طرح غیر معصوم ہوتا ہے۔

مولوی حامد رضا: اکیلے شاہ صاحبؒ ہی کیوں؟ آپ علامہ شبلی کی ''سیرت النعمان'' اُٹھائیے، جس میں صاف لکھا ہے کہ ''امام ابوحنیفہؒ پہلے شخص ہیں جنھوں نے تدوینِ فقہ کے سلسلے میں احادیث جناب رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دو اقسام پر منقسم کیا۔

اوّل: وہ جن کا منصبِ رسالت سے تعلق ہے۔ یعنی جو آپ نے بحیثیت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیان فرمائیں۔

دوم: وہ جن کا منصبِ رسالت سے کوئی تعلق نہیں''۔

کیا آپ نے توجہ فرمائی کہ معاملہ صرف علماء کی آراء تک نہیں، بلکہ اس کی جڑیں باقاعدہ تقسیمِ احادیث میں پیوست ہیں۔ اسی پر آئندہ رسول اللہ کی ''دُہری حیثیتوں'' کی عمارت استوار ہوئی۔ یہیں سے اُصولِ فقہ کے علماء کرام نے یہ قاعدہ وضع کیا کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ازروئے وحی فرماتے تھے، وہ ہر طرح کی خطاء اور غلطی سے مبرأ ہے۔ تاہم وحی کی عدم موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اجتہاد غلطی سے مبرأ نہ تھا۔ اس تاریخی حقیقت پسندی کی تصدیق مصر کے ڈاکٹر احمد امین، جو ''فجر الاسلام'' کے مؤلف تھے، بھی اپنے انداز میں کرتے نظر آتے ہیں۔

سیّد درویش: مولوی صاحب آج تک عیسائیوں کا مسئلہ ''الہوی تثلیث'' تو معلوم تھا؛ لیکن آپ کی برکتوں سے ''نبوتی ثنویت'' کا بھی پتہ چل گیا۔ خیر یہ نبوتی ثنویت کا معاملہ تو پیچھے امام ابوحنیفہؒ، بانیٔ فقہ حنفی تک جا کھڑا ہوا، اپنی بنیاد کے قیام میں۔ مطلب یہ کہ شاہ صاحبؒ نے صرف اپنے الفاظ میں دُہرایا۔

(پروفیسر امیر علی فوراً بولے:)

پروفیسر امیر علی: مولوی صاحب! آپ نے نہایت معتبر حوالے پیش کیے ہیں۔ لیکن آپ نے جو مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی ہے وہ صریحاً ٹھیک نہیں۔

سیّد درویش: پروفیسر صاحب اس میں اخذ والی کیا بات ہے؛ امام ابوحنیفہؒ نے جو فرمایا، شبلی صاحب نے بتا دیا۔

پروفیسر امیر علی: میں سمجھتا ہوں کہ اُن کے مؤقف کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

سیّد درویش: آپ کا مطلب یہ ہے کہ بات ٹھیک کہی، لیکن رنگ غلط دیا ہے۔ لیکن رنگ کچھ بھی ہو، اصل تو وہی رہتی ہے۔ خیر آپ اب یہ چاہتے ہیں کہ مولوی صاحب کا رنگ اُتار دیں اور بات پر اپنا رنگ چڑھا دیں۔ یعنی آپ اصل کو رنگ میں قابلِ دید بنانا چاہتے ہیں۔ تو پھر بسم اللہ کیجئے!

پروفیسر امیر علی: دیکھیں یہ حقیقت مدنظر رکھنا ہو گی سیّد صاحب، کہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے ''ثنویتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' کا مسئلہ تھا نہ مقصد۔ آپ کا مقدمہ تو تطہیرِ احادیث کیلئے سنہری قاعدہ درایت کو قائم کرنا تھا۔

سیّد درویش: یعنی آپ ''نبوتی ثنویت'' کی بجائے اصل بات پر ''قاعدہ درایت'' کا سنہری رنگ چڑھانا چاہتے ہیں۔

پروفیسر امیر علی: سید صاحب بات رنگ کی نہیں، بلکہ حقیقت یوں ہے کہ امامِ اعظم سے پہلے جس قدر محدثین گزرے، اُنہوں نے روایتِ حدیث کے سلسلے میں صرف اس حد تک غور کیا کہ آیا اُس کا راوی ثقہ تھا یا غیر ثقہ تھے۔ کوئی درایتِ حدیث کی طرف جاتا ہی نہ تھا۔ بے شک حدیث خلافِ عقل ہی کیوں نہ ہو، کسی کو اُس کی داخلی یا خارجی معقولیت سے سروکار نہ ہوتا تھا۔ علامہ شبلی ''سیرت النعمان'' میں لکھتے ہیں کہ ''اس وقت تک عقل کا نام لینا ایک جرم عظیم تھا۔ امام ابوحنیفہؒ نے رائے عامہ کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے درایت احادیث کا یہ اہم ترین اُصول پیش کیا کہ جو حدیث عقل کے صریحاً خلاف ہو، وہ غیر معتبر ہو گی''۔

چنانچہ علامہ صاحب خود اس زمرے میں حدیث کے کمزور ثابت ہونے میں درایت کے حوالے سے بڑے افسوس بھرے لہجے میں ''**تلک الغرانیق العلی**'' والی روایت پیش کرتے ہیں: ''رسول اللہ کی زبانِ مبارک میں سورۂ نجم کی تلاوت کے وقت بتوں کی تعریف میں شیطان نے یہ الفاظ ڈال دیئے کہ ''یہ بت بہت معزز ہیں اور ان کی شفاعت کی اُمید کی جاسکتی ہے''۔ یعنی ''**تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن الترتجی**''۔

سیّد درویش: پروفیسر صاحب کیا خیال ہے، شبلی صاحب نے درایت اور روایت کی بحث میں بڑی جاندار حدیث کا حوالہ نہیں دیا؟

پروفیسر امیر علی: ذرا آگے سنئے حدیث کے الفاظ: ''تلاوت جونہی ختم ہوئی جبرائیل آتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ میں نے تو یہ الفاظ آپ کو وحی کیے ہی نہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہاں سے پڑھ ڈالے؟''

سیّد درویش: ویسے کمال نہیں کہ جبرائیل کو بھی پتہ نہ چلا اور پوچھتا ہے کہ کہاں سے پڑھ ڈالے؟ شیطان اتنا تیز رفتار کہ آیا، کام کیا اور ایسے گیا کہ فرشتے کو بھی کانوں کان خبر نہ ہو پائی!

مولوی حامد رضا: (فوراً بولے:) پروفیسر صاحب اس حدیث کو قاضی عیاض اور ابوبکر بیہقی جیسے گراں قدر محدثین نے غلط قرار دیا ہے۔

پروفیسر امیر علی: میں مانتا ہوں۔ لیکن یہ مت بھولیں کہ محدثین ہی کے ایک بڑے گروہ نے اس کو اب بھی صحیح تسلیم کیا ہے۔ متاخرین میں حافظ ابن حجر کی تائید بھی شامل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کی صحت سے انکار محال ہے کیونکہ اس کے رواۃ ثقہ ثابت ہیں۔ اور کون اہلِ علم حافظ ابن حجر، مؤلف ''صواعق المحرکہ'' جیسے جید و نامور محدث سے ناآشنا رہ سکتا ہے۔

سیّد درویش: یہ تو دنگل شروع ہو گیا۔ ایک طرف قاضی عیاض اور ابوبکر بیہقی والے، تو دوسری طرف حافظ ابن حجر والے۔ لیکن پروفیسر صاحب آپ ابھی تک بحث کے بنیادی نقطے کو نظر انداز کرتے چلے آ رہے تھے؛ جس کا شاید، بلکہ غالباً آپ کو اندازہ نہیں۔

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب وہ کیا؟

سیّد درویش: دیکھیں آپ نے ''قاعدہ درایت'' کے متعلق جو بحث فرمائی اُس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ابوحنیفہؒ حدیث کے ہرگز مخالف نہ تھے؛ بلکہ اُن کا قیام تو عقل کے منافی احادیث کے خلاف تھا۔ یہاں تک بات سمجھ آ گئی۔ بات جو عقلی تھی! لیکن آپ مولوی صاحب کی بات کا احاطہ نہیں کر پائے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ امام ابوحنیفہؒ نے صحیح احادیث میں بھی پاک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت کو مطلقہ نہیں بلکہ منقسم جانا۔ یہ امر آہستہ آہستہ حل ہونے والا ہے۔ لیکن اس مرحلہ فکر پر آپ نے درایت کے حوالے سے نہایت اہم اور پیچیدہ بحث چھیڑ دی ہے۔ کیا آپ اُن وجوہات پر ضیا پاشی کریں گے جن کی بناء پر احادیث کو درایت کی منطقی کسوٹی پر رکھنے کی اس قدر اشد ضرورت در پیش آ گئی؟

پروفیسر امیر علی: یہ ضرورت امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں اچانک حادثاتی طور پر سامنے نہ آ ٹپکی۔ بلکہ یہ تاریخِ اسلام میں حدیث کے باب کی ایک کڑی ہے۔ آپ نے فنِ حدیث میں ''قاعدہ درایت'' پچھلے اسلامی اَدوار میں انجام پانے والی غلط روایات کے سدّ باب واسطے مرتب کیا۔ آپ حدیث کو تاریخی ملاوٹ، جو پچھلی تاریخ میں احادیث کے باب میں ہو چکا، سے صاف کرنا چاہتے تھے۔

سیّد درویش: کیوں! کیا ہوا تاریخ وضع احادیث میں؟

پروفیسر امیر علی: کون نہیں جانتا کہ زمانۂ رسالت میں ہی منافقین کی اتنی زیادہ تعداد خوف اور مصلحت کے تحت حلقۂ اسلام میں گھس چکی تھی کہ باقاعدہ ''سورۃ منافقون''

اللہ تعالیٰ نے نازل کی۔ یہ منافقین جو اپنی فطرت میں کمپیوٹر کے وائرس کی مانند ہوتے ہیں، جس کا کام ہی انفارمیشن کو کرپٹ کرنا ہوتا ہے، رحلتِ پیغمبر کے ساتھ ہی خودبخود ناپید یعنی ڈیلیٹ نہ ہو گئے؛ بلکہ اُدھر ہی مکے اور مدینے کی دنیا میں موجود تھے۔ اگر وائرس کو فعال ہونے کا موقعہ میسّر نہ آئے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ موجود ہی نہیں ہے۔

عہدرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فوراً بعد ان کو چونکہ مؤثر ماحول نہ مل پایا اپنا معلوماتی فساد عام کرنے کیلیئے، تو ان کے ناپاک عزائم اپنے حلقے تک ہی محدود رہے۔ مولانا مودودی اپنی ''خلافت وملوکیت'' میں یہ کھل کر کہہ گئے ہیں کہ جونہی عہدعثمانیہ کا آخری زمانہ آیا؛ صوبوں کی بدانتظامی، عہدہ دراری کی بدعنوانی، عدل کی عدم موجودگی، اقتصادیاتی ظلم اور طبقاتی کشمکش نے فتنوں اور فسادات کا ایک بازار گرم کر دیا۔ اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام اور امیرشام میں جنگی اور سیاسی کشمکش کا آغاز ہوا۔ حالات یکسر بدلنا شروع ہو گئے۔ اِسی وقت کا منافقوں کو انتظار تھا۔ اُن کی خواہشات کا سرد آتش فشاں اُبلنے لگا اور وہ اپنے لاروے میں سے باہر آ نکلے۔ یہاں تک کہ بنواُمیہ خلافت پر براجمان ہو گئے۔ علامہ شبلی اپنی ''سیرۃ النبی'' جلد 1 میں وضع احادیث کی بابت لکھتے ہیں کہ ''حدیثوں کی تدوین بنواُمیہ کے زمانہ میں ہوئی، جنہوں نے پورے 90 سال سندھ سے ایشیائے کوچک اور اُندلس تک مساجد میں آلِ فاطمہ علیہم السلام کی توہین کی اور جمعہ میں سرِ منبر حضرت علی علیہ السلام پر لعن کہلوایا۔ ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں''۔

سیّد درویش: یعنی یہ احادیث سازی بنواُمیہ کے ہتھے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کیلیئے، اہل بیت علیہم السلام کے خلاف، جن سے اُن کو ہمیشہ سیاسی خطرہ لاحق رہتا، منافقین کا یہ مؤثر آلہ چڑھ گیا۔

پروفیسر امیر علی: جی ہاں! اور اس کے ساتھ ساتھ جس سوچ نے وضع احادیث کو عام رُجحان میں بدلا وہ مذہب ارجاء، بنواُمیہ کے نظریہ حکومت کی رُوح ثابت ہوا؛ جس کے حامی مرجیہ کہلاتے تھے۔

سیّد درویش: ذرا اپنی زبانی مذہب ارجاء کو روشن میدان میں لائیے گا۔

پروفیسر امیر علی: ارجاء کے دو معنی ہیں: (i) مؤخر کرنا (ii) اُمید دلانا۔

سیّد درویش: کیسی تاخیر؟ اور کیسی اُمید؟

پروفیسر امیر علی: اہلِ ارجاء، یعنی مرجیہ کا یہ ماننا تھا کہ قتلِ عثمانؓ جمل اور صفین میں کسی ایک جماعت سے برأت کا ارتکاب کرنا جائز نہ ہے۔ اُن کے نزدیک سبھی صحابی ثقہ اور قابلِ اعتماد تھے۔ چنانچہ اُن کا معاملہ سپردِ خدا کر دینا چاہیے۔ وہ کہتے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور وہی آخرت میں فیصلہ کرے گا۔ لہٰذا سب آخرت تک مؤخر کر دو۔ اس عقیدے کا حصہ دوم، اُمید دلانا تھا۔ وہ کہتے کہ ہر گناہ گار مومن کو نجات کا اُمید وار ہونا چاہیے۔ ان کے حساب میں خوارج، شیعانِ علی علیہ السلام اور بنواُمیہ کے امراء سبھی برابر تھے، جبکہ کافر کوئی نہیں۔

سیّد درویش: یعنی بنواُمیہ نے ڈاکٹر فاسٹس (Dr. Faustus) کی غیب کر دینے والی انگوٹھی اپنے اقتدار کے استحکام کی اُنگلی میں پہن لی۔ اِدھر گھماؤ، اُدھر ہر بُرائی، جرم، گناہ، تنقید اور تبصرے کی آنکھ سے یکسر اوجھل ہو جائے۔ یا Hollow Man کی طرح غائب ہو کر جو جی چاہے کرو۔

لیکن اس کا وضع احادیث اور امام ابوحنیفہؒ کی تطہیر احادیث سے کیا تعلق بنتا ہے؟

پروفیسر امیر علی: مذہب ارجاء نے قاتل، ظالم اور منافق کو تنقید سے بچا کر کھلا، آزاد چھوڑ دیا۔ یعنی تم مؤمن ہو کیونکہ تم نے توحید اور رسالت کا زبانی اقرار کیا ہوا ہے؛ اس لیے جو جی میں آئے کرو، اللہ معاف کرنے والا ہے۔ یوں بنواُمیہ کو اجازت نامہ مل

گیا، اور اُن کے تاریخی کرداروں پر تنقید کرنے کا کسی کو کوئی حق باقی نہ رہا کیونکہ فیصلے کا حق صرف اللہ کو ہی قیامت والے دن حاصل ہے۔ اور وہاں بھی اُس کے رحم سے اُن کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

اب یہ ہی وہ عقیدۂ ارجاء ہے جس پر بنوامیہ نے ''**الصحابہ کل ھم عدول**'' کی حدیث وضع کر کے وضع احادیث کی عمارت استوار کر دی۔ یہ سوچ ہی آہستہ آہستہ اس عقیدے میں تبدیل ہونے لگی کہ صحابہ کے اقوال و افعال کی تحلیل ہو سکتی ہے نہ تشریح۔ وہ سبھی کلمہ گو اور معصوم ہیں۔ آپ نے دیکھا کیسا چولی دامن کا ساتھ نکلا مذہب ارجاء اور وضع احادیث میں؟ اور بنوامیہ مذہب ارجاء کی اس وضع کردہ حدیث کے پیچھے چھپ گئے۔ مذہب ارجاء وضع احادیث کی زبان میں بولتا تھا۔ اور صحابہ کرام کے اقوال و افعال پر لب کشائی اور خوردہ گیری معیوب خیال کی جانے لگی۔ کسی کے پاس کوئی جواز جائز نہ چھوڑا کہ وہ موضوع احادیث کی روک تھام کرے خواہ اُس کی متن عصمتِ انبیاء کے منافی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ عقیدہ ارجاء کا ہی اثر تھا کہ تمام صحابہ کے اقوال و افعال کو تنقید و تجزیہ اور تشریح و تحلیل سے بالاتر سمجھتے ہوئے ہر حدیث کو لوگوں نے شعوراً اور لاشعوراً قبول کرنا شروع کر دیا۔ اس ہی خوش عقیدہ کے حامی بعد میں ''اہل الرائے'' کے مقابلے میں ''اہلِ حدیث'' کے نام سے ملقب ہوئے۔

سیّد درویش: ان Data Corrupters کے خلاف اُس زمانے میں کوئی ردِّعمل سامنے کیا نہیں آیا؟

پروفیسر امیر علی: جی بالکل آیا، جس نے نہایت عقلی بنیادوں پر اہلِ ارجاء کو چیلنج کر دیا۔ یہ ردِّعمل مذہب اعتزال کہلوایا، اور اس کے پیروکار معتزلیہ مشہور ہوئے۔

سیّد درویش: پروفیسر صاحب فرقہ جبریہ اور فرقیہ صفاتیہ بھی کیا اس ہی زمانے کی پیداوار نہ تھے؟

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب آپ نے ٹھیک لفظ استعمال کیا ہے، یہ فرقے مذہب ارجاء کے زمانے کی پیداوار تھے، نہ کہ مذہب اعتزال کی طرح کوئی ردّعمل۔ یعنی یہ جبریہ اور صفاتیہ اہلِ ارجاء، مرجیہ کے متوازی تھے اپنی فکری پیداوار میں، نہ کہ معتزلہ کی طرح متصادم۔

فرقہ مرجیہ داعی تھا کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے۔ اگر مؤمن دُنیا میں گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے تو بھی مؤمن ہی رہے گا اور مستحقِ جنت۔ لیکن حسن بصریؒ نے کہا: نہیں وہ منافق ہے۔ جبکہ خوارج کہتے تھے: وہ کافر ہے۔ اب ایک شخص ایسا اُٹھا جو کہنے لگا کہ گناہ گار مؤمن نہ کافر ہے نہ منافق، بلکہ فاسق اور مستحقِ دوزخ ہے۔ وہ حسن بصری کا شاگرد واصل بن عطا تھا۔ اُس نے اپنے استاد سے علیٰحدگی اختیار کر کے، مطلب اعتزال کیا اور معتزلہ کہلوانے لگا۔ وہ اس سوچ کا مبلغ تھا کہ مؤمن ہو یا منافق، اگر کوئی بھی ظلم کرتا ہے تو عدلِ الٰہی کے تحت اُس کو سزا ملنی ہے۔

دوسری طرف مذہب جبریہ کا بانی جہم بن صفوان اس عقیدے کا مبلغ تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ ہی کرتا ہے؛ سب اُسی کے اذن کا نتیجہ ہے۔ انسان اُس کیلئے اپنے اعمال میں مانند شجر و حجر فقط مجبور و محکوم ہے۔ آپ یوں کہہ لیں کہ اللہ مچھر اور مکھی سے بھی وہی کام لے سکتا ہے جو انبیاء علیہم السلام بھی بغیر اذنِ الٰہی از خود سرانجام دینے سے قاصر ہوں گے۔ جبکہ صفاتیہ مقاتل بن سلیمان کہتا تھا کہ ''خداوند عالم اپنی صفات میں مانندِ مخلوق ہے''۔

سیّد درویش: آپ نے کہا کہ عہد رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے اختتام سے لے کر حضرت عثمانؓ کے آخری زمانہ تک منافقین خاموش اور بے بس تھے۔ مطلب موجود تھے، اگرچہ معلوماتی زہر پھیلانے کے مواقع حاصل نہ کر سکے۔ ہم یہ بھی جان چکے کہ منافقوں کی مذمت میں آیت بھی اُترتی۔ ذرا ان منافق معلوماتی جراثیموں کو روشنی ڈال کر سڑک

پر تو کھینچ باہر نکالیئے۔

پروفیسر امیر علی: حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں فرمایا: ''رسول اللہ کے عہد میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹ بولا جانے لگا تھا۔ یہاں تک کہ آپ نے ایک دن خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا کہ جو شخص مجھ پر ارادۃً دروغ بانی کرے گا، اُس کو اپنا ٹھکانہ دوزخ میں جان لینا چاہیئے''۔

احمد امین مصری نے بھی حضرت علی علیہ السلام کے قول کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث میں کی ہے: ''من کذب علی متعمدًا فلیتبو مقعدہ من النار''۔

سوال یہ پیدا ہو گیا کہ پہچان کیسے ہو کہ کون منافق تھے؟ چلو! اپنوں کو تو خبر تھی کون کیا ہے؛ لیکن آئندہ آنے والوں کو کیسے پتہ چلتا؟ اُن کو تو جو صحابی نظر آتا، وہ یہ ہی گمان کرتے کہ رسول اللہ کے کردار کی خوشبو میں سچا مؤمن ہی ہو گا۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صرف بارہ حواری تھے۔ اُن بارہ میں سے ایک نے اپنے آقا کو دشمنوں کے ہاتھوں صرف 30 سکوں کے عوض بیچ دیا۔ بحرالحمر سے بچ نکلنے والی قومِ موسیٰ علیہ السلام کے پاؤں خشک بھی نہ ہوئے تھے کہ اپنے نبی علیہ السلام کی نافرمانی پر اُتر آئے۔ آپ نے حارث جنّ کا حال نہیں دیکھا جو عبادت کرتے کرتے معلم الملائکہ بن گیا، لیکن جونہی وقت آیا تو ثابت ہوا، وہ تو تا قیامت ابلیس ہے۔ اور وہ اکیلا نہیں بلکہ صاحبِ اولاد ہے۔ اُس کی اولاد کے سر پر سینگ نہیں۔ اگر صحبت میں ضمانت ہوتی کہ کوئی اطاعت گزار ہی رہے گا تو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وہ نہ ہوتا جو ہوا۔ قیامت تک ابلیس کو باقاعدہ مہلت حاصل ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دُور میں اگر منافقین پیدا ہو گئے تو اس میں کون سی نئی یا پھر عجوبہ بات ہے؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تو کام تھا کہ انسان تک حق کا پیغامِ الٰہی پہنچا دینا۔ اچھائی اور بُرائی کے دونوں راستے بتا دیئے: باقی انسان عقلی طور پر صاحبِ اختیار ہے کہ اتباعِ حق کرے یا سرکشی کا راہ

اختیار۔ ڈاکٹر احمد امین کہتے ہیں کہ یہ ہی عدل و ذمہ داری کا مؤقف جب معتزلیوں نے صحابہؓ کیلیئے اختیار کیا تو عوام اُن کی دشمن ہوگئی۔ آپ کا یہ ہی کہنا ہے کہ یہ وہ وجہ تھی جس نے اہلِ حدیث کو آپ کا دشمن بنا دیا۔ ''معتزلہ نے صحابہ کرام کو وہی رُتبہ دیا جو عام مسلمانوں کا ہوتا ہے۔ انہوں نے اُن کی کسی معصومیت کا اعتراف نہیں کیا بلکہ جرات کر کے اُن کے اعمال کی تشریح شروع کر دی اور اُن کی بعض باتوں کو وہ صحیح قرار دیتے تھے اور بعض کو غلط''۔

سیّد درویش: ہم یوں کہہ لیتے ہیں کہ معتزلہ نے مرجیہ کے Anapodeictic مؤقف کو Apodeictic تنقید کے دائرے میں پابند کر لیا۔

پروفیسر امیر علی: ہم کہہ سکتے ہیں۔ معتزلہ سوچ کو یہ فکر بھی لاحق ہوگئی کہ مسلمان کیوں بلاامتیاز ہر صحابی کے نام پر ایسی موضوع احادیث جو اپنے متن میں عقلاً محال نظر آتی ہیں، کو اختیار کرتے جا رہے ہیں؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ خوش اعتقادی جو آج تنقید اور تحقیق کو گناہ سمجھ بیٹھی ہے، آنے والے کل میں اہلِ اسلام کے قوائے فکریہ کو ہی شل اور معذور کر کے رکھ دے۔ اس امر کے سدّ باب واسطے اُنہوں نے دو طرفہ مؤقف اور حکمت عملی اختیار کی۔ (i) اُنہوں نے صحابہ کی نسبت یہ غلو کھلا چیلنج کر دیا کہ وہ سبھی عادل اور بے گناہ ہیں۔ (ii) من گھڑت حدیثوں کی حوصلہ شکنی کرنے کیلیئے اُنہوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ صحابہ کے اقوال و اعمال پر نقد و تبصرہ کرنا بالکل جائز اور عقلاً درست ہے، کیونکہ وہ انسان ہونے کے ناطے غلطیوں کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ چونکہ انسان خطاء کا پتلا ہے، اس لیے ایسی احادیث خواہ وہ کسی صحابی نے ہی کیوں نہ پیش کی ہوں، جن سے توحید باری تعالیٰ پر زدّ پڑتی ہو؛ عدلِ الٰہی میں فرق آتا ہو؛ یا عصمتِ انبیاء علیہم السلام کی نفی ہوتی ہو، یا مشکوک ہو جائے، سبھی قابلِ تردید ہیں۔ اس طرح اُنہوں نے حدیث کے علم میں توحیدِ الٰہی، عدلِ الٰہی اور عصمت الانبیاء علیہم السلام کو معیار بنایا۔ اب صحابہ کی

معصومیت کا حدیث میں معیار ختم ہونے کے بعد، تمام دیگر مسلمانوں کی طرح اُن کو روزِ قیامت سزا و جزا کیلئے اللہ کے پیش اپنے اعمال کا جواب دے، قرار دے دیا گیا۔

آج تک تو ہر شخص ''قال رسول اللہؐ'' کہہ کر شروع ہو جاتا تھا۔ نہ کوئی سند کا مطالبہ نہ درایت کا مطالعہ درکار تھا۔ اب معتزلہ کی نقد و تبصرے کے اثر نے احادیث کی قبولیت کیلئے سند کے مطالبے کا قیام کر دیا۔ پہلا شخص جس نے اسناد کے ساتھ احادیث اکٹھی کیں، وہ ربیع بن صبیح (المتوفی 160ھ) تھا یا سعید بن عروبہ (المتوفی 156ھ)۔

سیّد درویش: پروفیسر صاحب امام احمد بن حنبلؒ سے معتزلہ حکومت نے کیوں سخت سلوک روا رکھا؟ کیا آپ اس حقیقت کو جھٹلا سکتے ہیں؟

پروفیسر امیر علی: جھٹلانے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم تاریخ کے آئینے میں دیکھ چکے ہیں کہ عقائد کی تشکیل کے اُس دُور میں معتزلے اکیلے مذاہب مرجیہ، جبریہ اور صفاتیہ کے خلاف میدان میں اُترے۔ اُنہوں نے علانیہ کہا کہ وہ تمام نظریات جو عدل، توحید خالص، عصمتِ انبیاء علیہم السلام اور اختیارِ انسانی کے منافی ہیں، اپنی جڑ میں دو وجوہات سے مشتق ہیں۔ اوّل یہ کہ تمام صحابہ کو بے گناہ، عادل اور معصوم جان کر اُن کے اقوال و افعال کو تنقید سے بالاتر سمجھا گیا ہے، حالانکہ بُروئے نصوص اُن میں منافق بھی شامل تھے۔ دوم: منسوب الیہ کی مسلّمہ صفات اور خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، عقل کی روشنی میں اُن منسوبات یعنی آیات و احادیث کی صحت و سقم پر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

چنانچہ معتزلہ نے اپنے اس تنقیدی مطالبے میں کوئی رعایت نہ برتی کہ اگر کوئی حدیث ایسی ہو جس میں منافی توحید یا عصمتِ انبیاء علیہم السلام مضمون بیان کیا گیا ہو تو اُس کا راوی کوئی صحابی ہی کیوں نہ ہو، قبولیت کیلئے بالکل لائق نہیں۔ ان عقائد کی بناء پر ہی معتزلہ اپنے آپ کو ''اہل التوحید والعدل'' بھی کہتے تھے۔ لیکن بدقسمتی یہ نکلی کہ اس

نظریہ تنقید وتبصرہ کو اہلِ حدیث نے اس قدر ناپسند کیا، شخصیت پسندی میں، کہ معتزلیوں کی مذمت میں ایک حدیث وضع کر کے اُن کو اُمت کا مجوس قرار دے دیا۔

مذہب اعتزال تین معتزلی عباسی خلفاء: مامون، معتصم اور واثق کے زمانے میں 198ھ سے لے کر 232ھ تک محیط رہا۔ حدیث پر حنفی اور معتزلی تنقید وتبصرے نے اہلِ حدیث کے علماء میں ایک گروہ کو ایسا بھڑکایا کہ وہ احادیث کو بلاتفریق مستند یا ضعیف، ذخیرہ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس طرح مسانید کا کام تیسری صدی میں شروع ہو گیا۔ 232ھ میں اب جب آخری معتزلی خلیفہ واثق باللہ عباسی مرا تو اُس کی جگہ متوکل آ گیا جو 247ھ تک خلیفہ رہا۔ یہ متوکل حجاج بن یوسف ثانی کہہ لیجئے! یعنی اُسی طرح جلاد، دشمن اہل بیت علیہم السلام اور علم وفلسفہ سے بیزار۔ پہلے سال تک تو عقل دوست معتزلی بنا رہا، پھر اچانک معتزلہ دشمن ہو گیا۔ پس تب سے معتزلیوں کا زوال شروع سمجھیں۔ جبکہ اہلِ حدیث کا ستارہ احمد بن حنبل کی صورت میں بلند ہونے لگا۔ اس سے قبل وہ معتزلہ خلفاء کے زمانوں میں بڑی شدید مخالفت، قید وبند اور تشدد کا شکار رہے۔ متوکل اب اہلِ حدیث کا ہم نوا ہو چکا تھا۔

سیّد درویش: سوال پیدا ہوتا ہے کہ متوکل کیوں اہلِ حدیث سے جا ملا؟

پروفیسر امیر علی: مسلمانوں کے علمی عروج وزوال کی علت کا اگر کوئی متلاشی ہے: تو اُس کیلئے متوکل کا زمانہ وہ صاف آئینہ ہے، جس میں ہم عقل اور نقل کی ہار جیت کے نتائج کا تاریخی مطالعہ بڑے احسن طور پر کر سکتے ہیں۔

اُس دورِ عباسیہ میں عقل واستدلال ہمیں صرف امام ابوحنیفہؒ کے فقہ، اور معتزلیوں کے عقائد میں ملتے ہیں۔ امام اعظمؒ نے فقہ میں تدوین کیلئے نہایت انقلابی طور پر اُن احادیث کو قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا جو عقل دشمن ہوں۔ جب امام ابو یوسف قاضی القضاۃ مقرر ہو گئے تو فیصلوں میں رائے اور قیاس کا آزادی سے استعمال ہونے لگا۔

دوسری طرف ہم معتزلی خلفائے ثلاثہ کے اَدوار، جو احمد بن حنبل کے زمانے پر مشتمل تھے، میں عقائد کی بڑی زبردست کشمکش دیکھتے ہیں۔ سب سے معرکتہ الاراء مسئلہ صفاتِ باری تعالیٰ تھا۔ معتزلہ کہتے تھے کہ خدا کی صفات اس کی ذات سے جدا نہیں بلکہ وہ عین ذات ہیں، کیونکہ اگر وہ اپنے طور پر قرار پائی جائیں تو خالق اور مخلوق میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ معتزلہ کا یہ بھی کہنا تھا کہ آیاتِ قرآنی میں رؤیت باری تعالیٰ قابلِ تشریح اور تمثیلی ہیں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر نظر میں آ جائے تو وہ ہماری طرح بصارت کی قیدو بند میں محصور ہو جائے گا۔ لیکن اہلِ حدیث کہتے کہ صفاتِ الٰہی اُس کی ذات سے علیٰحدہ ہیں، یعنی زائد بر ذات ہیں۔ مثلاً وہ علیم ہے علم سے؛ متکلم ہے کلام سے؛ بصیر ہے بصر سے۔ اس طرح اہلِ حدیث اب صفاتیہ مشہور ہو گئے۔ اب اس کشمکش کے ساتھ ساتھ دوسرا بڑا تصادم قرآن کے مخلوق اور قدیم ہونے پر تھا۔ اہلِ حدیث نہ صرف رؤیت کے قائل تھے بلکہ انسان کو مجبور اور اللہ کو احادیث کی رُوح سے فاعلِ حقیقی کہتے تھے۔

آپ یوں کہہ لیں کہ اُس معاشرے میں دو طبقے تھے: پہلا وہ عوامی اکثریت والا جس کی تخیلاتی نفسیات ہوتی ہے؛ اور دوسرا وہ پڑھا لکھا طبقہ تھا جو مجرد عقل وفہم کا قائل تھا۔ یعنی یہ تصادم عقلی معتزلیہ اور نقلی صفاتیہ کے مابین تھا۔

سیّد درویش: میں چاہتا ہوں کہ آپ اُس وجہ کو اب ذود ہضم صورت میں بیان کریں کہ کس طرح احمد بن حنبلؒ جیسے جید محدث حزبِ اختلاف بن کر حکومتِ وقت سے متصادم ہوئے؟

پروفیسر امیر علی: یہاں تک ہمیں پتہ چل گیا کہ حنفی فقہ اور معتزلی عقائد کے برعکس اہلِ حدیث نے ردّعمل میں تیسری صدی کے دوران مسانید لکھنا شروع کر دی تھیں۔ مسند کا مطلب ہی یہ ہے کہ موضوع سے قطع نظر ایک صحابی کی مرویات کو اکٹھا کر کے ایک باب میں، حدیث کا ایسا مجموعہ حاصل کر لینا۔ مسانید سازی کا پہلا گروہ عبداللہ بن موسیٰ

عبسی کوفی، مستدد بصری اور نعیم ابن حماد خزاعی پر مشتمل تھا۔ دوسرے حفاظِ حدیث مثلاً احمد بن حنبل، اسحٰق بن راھویہ، عثمان ابن ابی شیبہ وغیرہ بعد میں آئے۔ انہوں نے صحیح اور غیر صحیح سب احادیث کو اکٹھا کر دیا۔ اب ہوا یہ کہ خود اہلِ حدیث کیلئے بھی بحرانی صورتِ حال پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ اس پریشان دفتر کو سلجھانے کیلئے امام بخاری (المتوفی 256ھ) ایک نیا اسلوب، نیا اصلاحی اسلوب اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ آپ نے احادیث کے ڈھیر میں سے صحیح احادیث کیلئے چھان بین شروع کر دی۔ جو آپ کو صحیح ''معلوم'' ہوئیں اُن کو اپنی کتاب ''صحیح بخاری'' میں محفوظ کر لیا۔ اس ہی نہج پر چھ مستند کتب، صحاح ستّہ لکھی گئیں جو مسانید کی ہی اصلاح شدہ شکل ہیں۔

اب احمد بن حنبل کی بیک وقت دو محاذوں پر جنگ واضح نظر آتی ہے۔ ایک طرف فقہ حنفی، تو دوسری طرف معتزلی عقائد۔ آپ متمنی تھے کہ ایسی فقہ مرتب کی جائے جس کی اساس محض قرآن و حدیث پر ہو۔ وہ حنفی المسلک فقہ اور معتزلہ عقائد کا، جو دونوں احادیث کو سقیم سمجھ کر ردّ کر دیتے تھے، بیک وقت انکار کرنا اسی لیے ناگزیر جانتے تھے۔ اپنی اس فقہ مدوّن میں اُنہوں نے اس قدر غلو برتا کہ علانیہ کہہ دیا کہ صاحبِ رائے و قیاس کیسا ہی سلیم العقل کیوں نہ ہو، اس کے مستنبط مسئلہ کو قبول نہ کیا جائے۔ جبکہ اُس کے متقابل ضعیف الحدیث شخص زیادہ قوی الاعتبار ہوتا ہے خواہ وہ حدیث کی صحت و سقم کی معرفت نہ بھی رکھتا ہو۔ یعنی اُنہوں نے معتزلی حکومت کی حنفی رٹ کو چیلنج کر دیا۔ یاد رہے احمد بن حنبل نے 241ھ میں وفات پائی۔

سیّد درویش: یعنی احمد بن حنبلؒ جب عقل و قیاس کو فقہ میں دیکھتے تو حنفی مسلک نظر آتا؛ جب عقائد میں جھانکتے تو وہ مذہب اعتزال بن جاتا۔ آپ کیلئے دونوں ہی ایک سکے کے دو رُخ تھے۔

پروفیسر امیر علی: آپ کی سکے کے دو رُخوں سے تشبیہ بالکل موزوں ہے۔ امام

ابوحنیفہ کوفی نے خود اپنی تدوین فقہ میں بیشتر قرآنی آیات سے کام لیا، اور ضرورت کے مطابق استنباطِ مسائل میں قیاس اور رائے کا آزادانہ استعمال کیا۔ تاہم حدیث کے ساتھ آپ کا رویہ نہایت ہی محتاط تھا۔ فقہ حنفی اپنی دُنیاوی افادیت Pragmatism کی وجہ سے حکومت کی نظر میں بہت جلد مقبولیت حاصل کر گیا، کیونکہ رائے اور قیاس کا استعمال نت نئے سیاسی، تمدنی، اخلاقی، سماجی اور دیگر تمام مسائل کا حل تلاش کرنے میں بدلتے ہوئے وقتی تقاضوں کی ضرورت نہایت احسن طور پر پوری کرنے کی قوت رکھتا تھا۔ یہاں یہ امر سمجھنے کی اشد ضرورت ہے کہ احادیث پر فقہ میں تنقیدی احتیاط صرف امام ابوحنیفہ نے ہی نہیں برتی، بلکہ امام شافعیؒ اور امام مالک نے بھی نہایت غور وفکر کے بعد احادیث کا انتخاب کیا۔ امام مالک نے امام اعظم ہی کے زمانے میں فقہ کی مدینہ منورہ میں تدوین شروع کی۔ آپ نے آغاز میں تو چار ہزار احادیث اکٹھی کیں؛ لیکن اپنی عمر کے آخری 40 سال میں بھی اُنہیں روایت اور درایت پر پرکھتے چلے آئے: آپ اپنی فقہ میں تاہم اہلِ حجاز سے ہی مخاطب تھے۔ امام شافعیؒ نے احادیث اور قیاس میں درمیانی راہ اختیار کی اور احادیث جمع کر کے فقہ کی تدوین کی غرض سے اُصول روایت و درایت کا باقاعدہ وضع کر کے منضبط کیا۔

یہاں قابلِ غور امر یہ ہے کہ ان تینوں اماموں نے عقائد کی بات نہ کی۔ یہ امام حنبل ہی تھے جنہوں نے فقہ کے ساتھ عقائد کو بھی یکجا کر کے ایک عوامی تحریک کا حکومت کے اعلیٰ طبقے کے خلاف آغاز کیا۔

سیّد درویش: آپ نے فقہ کی جو درجہ بندی کی ہے، اُس کی روشنی میں ایسا لگتا ہے کہ معاشرہ اُس وقت دو نہیں بلکہ تین اہم طبقات میں تقسیم تھا۔ اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقہ فقہ حنفیہ کا پیروکار تھا؛ کیونکہ اُن کا جدید، بین الاقوامی اور نفیس تمدنی، معاشرتی، اخلاقی، معاشی بلکہ سیاسی معاملات سے واسطہ تھا، جس کیلئے عقل و قیاس درکار ہوتے ہیں۔ ان

تمام معاشرتی ارتقاء سے جنم لینے والے مسائل و معاملات کے عقدوحل کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں کوئی ٹھوس مثالیں کیونکر ہوسکتی تھیں، جب وہاں حالات و واقعات ہی کوئی اور تھے۔ دوسرے نمبر پر آ گیا متوسط طبقہ، جو اپنے مسائل کیلئے فقہ شافعی کی طرف رجحان رکھتا تھا۔ باقی رہ گیا ادنیٰ طبقہ، جو اکثریت پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ طبقہ اعتقاداتی جذبات اور تخیلات کی دنیا ہوتی ہے؛ جس کی دلی تشفی امام حنبل کے مسلک میں ہی ہوسکتی تھی۔ مجھے اس اعتقاداتی اور فقہی تصادم اور تقسیم کے پیچھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مارکس ازم کی طبقاتی جنگ کارفرما تھی، جس میں اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ طبقات کے معاشی مفادات کا ہر کوئی ابوحنیفہؒ شافعیؒ اور امام حنبلؒ کی زبان میں تحفظ کر رہا تھا۔ یہ الگ بے شک مذہبی حقیقت اپنی معاشی مماثلت کے باوجود، مارکس ازم سے بنیادی طور پر الگ اور بلند ہے۔

پروفیسر امیر علی: بے شک عوام کا بڑا حصہ، جو معاشرے میں محرومی اور استحصال کا شکار تھا، اُسے کیوں اُن عقائد اور عقل و رائے والوں سے نفرت نہ ہوتی، جن کو وہ اپنی محرومیوں کا مجرم گردانتے تھے۔ دوسرا وہاں عربی اور ایرانی تعصب بھی غیر اہم نہ تھا۔

دربار میں ایرانی ثقافت کا نمایاں اثر اور رنگ تھا۔ صفاتیہ عوام کا سیدھا سادہ یہ ردِّعمل اعلیٰ معتزلی طبقے کے خلاف اُبل رہا تھا جن کی تاویلات اور عقلی احادیث عمومی سطح سے بلند تھیں۔ متوکل نے بھانپ لیا کہ حکومتی کمزوریوں سے تنقید کی آنکھ ہٹانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہجوم سے مل جاؤ اور سارا نزلہ اشرفیہ اور اعلیٰ حکومتی طبقے اور سابقہ نظام کارافراد پر پھینک کر بری الذمہ ہوجایا جائے۔ اُس نے موقع شناسی کرتے ہوئے اہل التوحید والعدل کو خیر باد بولا اور صفاتیہ کا ہمنوا بن گیا۔ سارے عوامی غصے کا منہ اُس نے سابقہ حکمران طبقے کی طرف پھیر دیا۔ عوام کو جذبات کی تسکین کا بھرپور موقعہ مل گیا، اور خود وہ ظالم حکمران ترکوں کی گود میں سامرا بیٹھ کر عیش وعشرت کے مزے لوٹنے لگا۔ تمام

معتزلہ درس گاہیں بند! تمام فلسفہ، ادب اور معقولات کی کتابیں ممنوع! اور معتزلہ سرکاری افسران کو ملازمتوں سے غلیظ مکھی کی طرح ہٹا دیا۔

پتہ چلا کہ حدیث کا معاملہ نظریہ تخنطیہ الانبیاء علیہم السلام کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی علمی تاریخ سے کس قدر گہرا ملا ہوا ہے! میں حیران ہوتا ہوں اُن پڑھے لکھے لوگوں پر جو یہ رونا روتے ہیں کہ جی ہلاکو خان کے سقوطِ بغداد نے مسلمانوں میں علم وفضل کے راہ بند کر دیئے۔ جبکہ اصل مجرم تو یہ خلیفہ متوکل تھا، جس نے رومن شہنشاہ جسٹینین (Justinian) کی طرح علم کو کھنڈر کر دیا۔ منگول خان تو مسلمانوں کی علمی لاش صرف دبانے آیا تھا؛ جس کی آخری سانسیں امام غزالی ہی اپنے زمانے میں گُل کر چلے تھے۔

سیّد درویش: ابوحامد الغزالی کا مسلمانوں کے علمی زوال اور حدیث سے کیا لینا دینا ہے؟

پروفیسر امیر علی: آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ وضع احادیث اور مسلمانوں کے علمی عروج وزوال کا عقلی اور تنقیدی طور پر نہایت منطقی تعلق ہے؟

سیّد درویش: جی۔

پروفیسر امیر علی: اور وضع احادیث کا مذہب ارجاء سے۔

سیّد درویش: جی ایسا ہی ہے۔

پروفیسر امیر علی: اور اہلِ ارجاء کا ماننا تھا کہ ''**الصحابہ کل ھم عدول**''۔

سیّد درویش: ایسا ہی ہے۔

پروفیسر امیر علی: بس مذہب ارجاء اور وضع احادیث کا سلسلہ امام غزالی پر ہی منطقی طور پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اگرچہ متوکل کے دور میں ہی عقل، سائنس اور فلسفے کی روحانی سانسیں مشکلات میں پڑنا شروع ہو گئی تھیں، لیکن زندگی چلتی رہی۔ جب بھی

معتزلیہ اور صفاتیہ میں بحث ومناظرہ ہوتا، تو اوّل الذکر بازی لے جاتے، کیونکہ اُن کے پاس بحث ومباحثہ کیلئے فلسفۂ یونان کے اُصول تھے۔ ان حالات میں ابوالحسن اشعری نامی ایک شخص جو معتزلی عالم تھا، اُس نے مذہب صفاتیہ اختیار کر کے اُس کی عقائد اور علم الکلام میں تائید کا پرچم بلند کر دیا۔ متوکل کے بعد یہ دوسری بڑی تبدیلی اتنی زبردست اہم تھی کہ صفاتیہ اب ''اشعریہ'' ہی کہلوانے لگے۔

ابوالحسن اشعری نے آیاتِ متشاہیات واحادیث کو ''بلا کیف'' یعنی بغیر سوال جواب کے، اُن کے ظاہری معنوں پر محمول کرنے کا قاعدہ تشکیل کر دیا۔ اشعری اُصولِ عقائد کو ہی ابواحمد الغزالی نے حتمی صورت عطا کی۔ ان کا نظریہ بھی وہی تھا کہ منافقین ومؤمنین میں امتیاز کئے بنا ہر شخص کو جس پر لفظ صحابی کا اطلاق ہوسکتا تھا، معصوم اور عادل سمجھ لینا لازم ہے، اور اُن سے حاصل کردہ ہر حدیث بنا تنقید قابلِ قبول ہے۔ امام غزالی نے فلسفے اور سائنسی علوم جیسے طب، طبیعیات، کیمیا اور ریاضی وغیرہ کو شر کے دروازے کہہ کر تصوف کے فروغ میں مسلم دنیا، جہاں جہاں اُن کیلئے احترام پایا جاتا تھا، سے جلاوطن کر دیا۔

(ابھی پروفیسر صاحب نے بات مکمل کی ہی تھی کہ مولوی صاحب بول اُٹھے)

مولوی حامد رضا: پروفیسر صاحب یہ کیسے ممکن ہے کہ امام غزالیؒ جیسا منصفانہ، درویش اور عالم انسان مذہب ارجاء کی سطح پر آ جائے۔

پروفیسر امیر علی: اچھا آپ پھر خود ہی انصاف کیجئے گا۔ آپ کے مصنفانہ امام غزالی اپنی مشہور کتاب ''المستصفی'' میں لکھتے ہیں: ''تمام صحابہ کا عادل ہونا ایک جانی ہوئی چیز ہے۔ اس لیے اللہ نے اُن کو عادل قرار دیا ہے اور اپنی کتاب میں ان کی تعریف کی ہے۔ پس ان کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ ہے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ کسی صحابی کی بابت قطعیت کے ساتھ یہ ثابت ہو جائے کہ اُس نے جانتے ہوئے فسق و فجور کا ارتکاب کیا۔ لیکن چونکہ یہ ایسی چیز ہے جو ثابت ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اِن کے بارے

میں جرح وتعدیل کی ضرورت نہیں''۔

(یہ سن کر مولوی صاحب تو خاموش ہو گئے۔ سیّد درویش نے اُن کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے......)

سیّد درویش: کیا ضرورت تھی مولوی صاحب بیچ میں بولنے کی۔ پروفیسر صاحب کو اپنی بات پوری کرنے دیتے۔ آپ نے اُلٹا اُن کے ہی منہ میں بات دے دی۔ کیا فائدہ ہوا؟ لگتا آپ خاموشی کے جہاز میں بیٹھ کر اہلِ ارجاء کے زمانے میں جا پہنچے ہیں۔

(مولوی صاحب ہنس پڑے اور سیّد درویش بولے:)

سیّد درویش: پروفیسر صاحب آپ نے وضع حدیث پر ایسی مسرور کن بحث کی ہے کہ میرا دل چاہنے لگا ہے میں جادو کا فن سیکھ لوں۔ یہ علم بھی فن کاری ہے۔

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب یہ وضع احادیث کا جادو کے فن سے کیا تعلق ہے؟ پھر علم اور فن کا تعلق کیا ہے؟ میں کچھ سمجھ نہیں پایا!

سیّد درویش: علم کا مطلب ہے جاننا؛ فن کا مطلب ہے کرنا؛ اور جادو وہ علمی فنکاری ہے جو دھوکہ کم از کم معلوم ہو۔ یعنی کمال کا علمی فن؛ تاہم دھوکہ بھی ہو سکتا ہے؛ اور ہو سکتا ہے معجزے کی طرح حقیقت ہو۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام معجزہ کرتے؛ منکر کہتے جادو تھا۔ لگتا ہے آپ نے George Frazer کی کتاب ''The Golden Bough'' کا مطالعہ نہیں کیا۔ اُس نے جادو کے سائنسی علم ہونے پر بڑی فکر انگیز بحث کی ہے۔ جادو بھی کیمیا گری کی طرح ایک فن ہے۔ فرض کریں آپ کسی ایسی غیر مہذب وادی میں جا گرے جہاں صدیوں سے سائنس نام کی بُو تک سونگھنے کو نہیں ملتی۔ آپ کے پاس دو قسم کے سلنڈر رہیں، ایک آکسیجن کا دوسرا ہائیڈروجن کا۔ اچھا وادی خشک پڑی ہے۔ انسان اور جانور ہلاکت کا پانی کی قلت سے شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آپ اب دونوں گیسوں کو ملاتے ہیں؛ ہلکا سا دھماکہ ہوا اور پانی کی جھیل بن گئی۔ اب بتائیں

آپ کیا جادوگر ہیں، یا کیمیا گر؟ فن نے علم کو جادو بنا دیا جو جانتے نہیں۔ آپ نے غیر مرئی عناصر سے آبِ حیات پیدا کر دیا۔ اُنہوں نے تو آپ کو سجدے شروع کر دینے ہیں۔ لیکن آپ کی گیس ختم نہیں ہونی چاہیے۔

(سبھی بے اختیار ہنسنے لگے)

پروفیسر امیر علی: جی ٹھیک؛ لیکن اس کا حدیث سے کیا واسطہ؟

سیّد درویش: بڑا واسطہ ہے۔ لیکن پروفیسر صاحب ذرا پانی کا مزہ تو لے لینے دیں جو آپ نے کرشمہ کیا ہے۔ اچھا آپ نے فنکاری دیکھی کہ سلنڈروں سے تو نکلی گیس اور بن کیا گیا مائع یعنی آب۔ تو جو کیمسٹری سے واقف نہیں وہ تو اسے کمال کہے گا؛ اور جو یہ فن کاری جانتا ہے اُس کیلئے یہ ناممکن نہیں۔ کیا ایسی ہی جادوگری آپ نے وضع احادیث میں مشاہدہ نہیں کی؟ ڈالو کچھ اور نکلے کچھ۔

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب میں پھر نہیں سمجھ پایا۔

سیّد درویش: پروفیسر صاحب آپ تو سمجھ میں مولوی صاحب سے بھی پیچھے رہتے جا رہے ہیں۔ لیجئے میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ دیکھیں بحث عصمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطلقہ ہونے پر ہے، احادیث کے مطالعہ میں؛ جبکہ ثابت صحابہ کرامؓ کی معصومیت ہوتی ہے۔ جس کی حدیث ہے اُس کیلئے تخطیہ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عقیدہ بنتا چلا گیا، اور جو حدیث کے راوی اور محدثین ہیں، وہ عادل اور معصوم ثابت ہوتے آ رہے ہیں۔ کیا یہ سارا علمِ رجال ایسی ہی معصوم اور عادل ساز کیمیا گری نہیں؟ جس میں عقل اور نقل کی دونوں گیسیں معصومیت کے نئے انکشاف، پانی کی پیدائش میں غائب ہو جاتی ہیں۔

پروفیسر امیر علی: لیکن ہماری بحث صرف عقلی تنقید سے ہی متعلق ہے۔

سیّد درویش: آپ کس عقل کی بات کر رہے ہیں؟ یہاں تو عقل بمعہ نقل پانی بن گئی ہے۔ جس شخص کو معلوم ہی نہیں کہ پانی کے پیچھے ہائیڈروجن اور آکسیجن نامی گیسیں

ہوتی ہیں، وہ پانی کی اپنی طبیعی اور کیمیائی خصوصیات پر تو سیر حاصل بحث کر سکتا ہے، لیکن اس کے پیچھے غیر مرئی حقیقت اُسے کون سمجھائے؟ پانی تو آگ کی ضد ہے، اُسے کون بتائے گا کہ آگ خود پانی میں بصورتِ آکسیجن موجود ہے؟ مطلب سارا عقل و استدلال تو محدود رہ گیا، آبی حالت تک ہی؛ یہ پانی کی حقیقت تو پانی میں نظر نہیں آتی۔ یعنی ایک سمجھ ہے ظاہریت تک محدود۔ دوسری عقل ہوتی ہے آبی ظاہریت کے پار غیر مرئی باطنیت کو جاننے والی۔

اب کون بتائے گا کہ ظاہری آبیت کی باطنی اصلیت وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن ہے؟ ان دونوں کے اجزاء میں وہ کون سی نسبت و تناسب تھا جس نے اس کو خاص حالات میں کچھ اور نہیں بننے دیا؟

پروفیسر امیر علی: یہ کوئی کیمیا دان ہی بتائے گا۔

سیّد درویش: اب اگر میں کہوں کہ حدیث کی ظاہریت بھی آبی ہے تو اس کی اصلیت کون بتائے گا؟

پروفیسر امیر علی: وہی جو حدیث کی حقیقت، باطنی اصلیت جانتا ہوگا۔

سیّد درویش: اچھا! جو حدیث کو اندر سے جانتا ہی نہیں، اُس کے حقیقی معنوں سے آشنا ہی نہیں، لیکن اُس کی ظاہریت پر کمال تنقید و تجزیہ کے قابل ہے؛ کیا اس کے باوجود وہ اُس کی اصلیت کے جاننے کا دعویدار ہو سکتا ہے؟

پروفیسر امیر علی: ناممکن ہے۔

سیّد درویش: آخر کیوں؟

پروفیسر امیر علی: اُسے پتہ ہی نہیں کہ آکسیجن کیا ہے، ہائیڈروجن کیا ہے۔

سیّد درویش: ایک شخص نے کبھی سُرخ رنگ دیکھا ہی نہیں، آپ اس کو کیسے سمجھائیں گے کہ سرخ رنگ ایسا ہوتا ہے؟

پروفیسر امیر علی: سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سیّد درویش: کون بتائے گا، کس سے پوچھیں؟

پروفیسر امیر علی: جس نے سرخ رنگ کو دیکھا ہو۔

سیّد درویش: اچھا! ایک بڑا سمجھدار آدمی ہے۔ تنقید اور قیاس کا بادشاہ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اُس نے کبھی سرخ رنگ نہیں دیکھا۔ کیا وہ عقلمند شخص سرخ رنگ پر تنقید یا بحث کر سکتا ہے کہ اسے ایسے ہونا چاہیے یا ایسا نہیں ہونا چاہیے؟ ایسا کیوں نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

پروفیسر امیر علی: اگر وہ واقعی ہی عقلمند ہے تو وہ کیوں لب کشائی کرے گا؟

سیّد درویش: یعنی آپ مجھ سے متفق ہیں کہ سرخ رنگ، پانی اور حدیث پر وہ ہی بحث کرنے کا حقدار ہو سکتا ہے جو ان کی باطنی حقیقت کو جانتا ہو گا۔

پروفیسر امیر علی: کیوں نہیں؟

سیّد درویش: اب صحیح حدیث کیلئے کس کو تلاش کریں؟

پروفیسر امیر علی: اُس لسانِ صدق کو جو حدیث کو اندر سے جانتا ہو۔ جسے پتہ ہو کہ یہ سرخ رنگ کیوں، کیسا اور کیا نہیں ہے۔

سیّد درویش: آپ کہنا چاہتے ہیں کہ حدیث اُس سے پوچھنی ہو گی جو اپنے الفاظ میں اس لیے صادق ہو کہ وہ جانتا ہے کہ اس کی باطنیت میں کیا رکھا ہے۔

پروفیسر امیر علی: بالکل صحیح!

سیّد درویش: پروفیسر صاحب ایک اور مشکل آن پڑی۔ آپ اس کو کشا کرنے میں میری مدد کریں تا کہ گفتگو کا سفر جاری رہ سکے۔ ایک بڑا زیرک اور منطقی آدمی ہے، لیکن اُس نے کبھی آم نہ دیکھا نہ کبھی کھایا، بلکہ اُس کو پتہ ہی نہیں وہ کیا بلا ہے۔ اگر وہ شخص منصف ہونے کی دعویداری میں آم کے متعلق انصاف کی کرسی پر بیٹھ گیا، وہ آپ

کی نظر میں کون ہوگا؟

پروفیسر امیر علی: بے شک مجرم۔

سیّد درویش: یعنی جہلت نے منصف کو عالم کی کرسی پر مجرم بنا دیا۔

پروفیسر امیر علی: جی ہاں۔

سیّد درویش: اس کا مطلب ہوا کہ عقلیں دو ہوئیں۔ایک عقل: مصنف، دوسری عقل: مجرم۔تنقیدیں دو ہوئیں، ایک منصف تنقید، دوسری مجرم تنقید۔

پروفیسر امیر علی: ایسا ہی ہے۔

سیّد درویش: مجھے سچی بات بتائیں کہ جب آپ کو عدل وانصاف چاہیے تو آپ منصف عقل کی طرف رجوع کریں گے یا مجرم کی طرف؟

پروفیسر امیر علی: منصف کی طرف لوٹوں گا، اور مجرم سے دور بھاگوں گا۔

سیّد درویش: کیوں؟

پروفیسر امیر علی: کیونکہ میری عقل کو انصاف صرف صادق سے ملے گا جو اصل حقیقت سے آگاہ ہوگا۔

سیّد درویش: بہت اچھا! فرض کریں ہمارے درمیان کسی حدیث کی درایت پر جھگڑا ہو جاتا ہے۔ چلو روایت پر شک ہو گیا۔ ہر ایک ہم میں برحق ہونے کا دعویدار ہے۔اب ہمیں کس کی طرف منہ کرنا چاہیے؟

پروفیسر امیر علی: اُس منصف عقل کی طرف جس کی لسانِ صدق سے اُس حدیث کی اصلیت کھل کر سامنے آ جائے۔

سیّد درویش: اگر وہ صادق خود نظر نہ آئے تو؟

پروفیسر امیر علی: کم از کم اُس صادق کے وکیل کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

سیّد درویش: ہم اس امر پر متفق ہیں کہ علم الحدیث میں خالی تنقید نہیں بلکہ

منصفانہ تنقید کی ضرورت ہے جو منصفانہ عقل ہی کرے گی۔ اور عقل وہ منصفانہ ہوگی جو حدیث میں حقیقت کو جانتی ہو۔ وہ منصف، حقیقت شناس عقل جس کی زبان سے جاری ہوگی، وہ صادق ہوگا۔ تو سمجھ کا اب تقاضا یہ ہے کہ اُس صادق کو تلاش کرے جس کی لسانِ صدق سے حدیث لینی ہے۔

پروفیسر امیر علی: آپ کا استدلال ناقابلِ تردید ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ صادق ملے گا کہاں؟ وہ ہے کون؟

سیّد درویش: جہاں حدیث ہے، جب تک حدیث ہے: صادق بھی موجود ہونا چاہیے۔ ہر طرف، جب تک فریبی پیتل سونے کے نام پر فروخت ہوگا، سونے کا وجود ختم نہیں ہوسکتا۔ حق کو جھٹلانے میں قہراً حق کے ہونے کی دلیل خود باطل دیتا ہے۔ آپ کیا صحیح میں صادق کو نہیں جانتے؟

پروفیسر امیر علی: اگر جانتا ہوتا تو سیّد صاحب پوچھتا کیوں؟

سیّد درویش: آپ جانتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔ اسے کہتے ہیں جان کر بھی نہ جاننا۔ پڑھی لکھی جہلیت۔

پروفیسر امیر علی: آپ کو کیسے یقین ہے؟

سیّد درویش: لو یہ ثابت کرنا بھی کوئی دشوار کام ہے۔ آپ خود ہی تو بتا چکے ہیں کہ شبلی نعمانی نے کہا: ابوحنیفہ کے زمانے تک مذہب میں عقل کا نام لینا تک جرم تھا۔ اور جب اُنھوں نے درایت احادیث اور استنباطِ مسائل میں عقل داخل کی تو سخت مخالفت ہوئی۔

پروفیسر امیر علی: جی ہاں؛ لیکن یہ کیا ثابت کرتا ہے؟

سیّد درویش: مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ علامہ صاحب نے یہ کیوں کہا؟

پروفیسر امیر علی: کیوں اس میں کیا سمجھ نہ آنے والی بات ہے؟

سیّد درویش: کیوں کہ میرے خیال میں تو امام ابوحنیفہؒ کے شیوخ میں ایک آدھ بھی ایسا نہیں ملتا جو خلافِ عقل رائے عامہ کے خلاف عمل پیرا ہو۔

پروفیسر امیر علی: میں حیران ہوں کہ آپ یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں؟

سیّد درویش: میں خود بڑا حیران ہوں کہ آپ میری وجہ سے حیران ہیں۔ کیا آپ میری اس دُہری حیرانگی سے کوئی مثال دے کر جان چھڑوا سکتے ہیں؟

پروفیسر امیر علی: دور کیوں جائیں، جب علامہ شبلی کا ہی ''سیرت النعمان'' میں یہ مشہور و معروف پیرا ہے کہ ''ابوحنیفہ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے امام باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت ہی نادر باتیں حاصل کیں۔ شیعہ و سُنی دونوں نے مانا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کی معلومات کا بڑا ذخیرہ حضرت ممدوح کا فیض صحبت تھا۔ امام صاحب نے ان کے فرزند رشید حضرت جعفر صادق علیہ السلام کی فیض صحبت سے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا جس کا ذکر عموماً تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ ابن تیمیہ نے اس سے انکار کیا ہے اور اس کی یہ وجہ خیال کی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ حضرت جعفر صادق علیہ السلام کے معاصر اور ہم عصر تھے۔ اس لیے ان کی شاگردی کیونکر اختیار کرتے۔ لیکن یہ ابن تیمیہ کی گستاخی اور خیرہ چشمی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ لاکھ مجتہد اور فقیہ ہوں، لیکن فضل وکمال میں انہیں حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے کیا نسبت؟ حدیث وفقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہل بیت علیہم السلام کے گھر سے نکلے''۔

سیّد درویش: ایسے لگتا ہے کسی قدیم دانشور کا یہ کمال فقرہ آپ کیلئے ہی لکھا گیا تھا کہ سمندر میں مچھلیاں پانی ڈھونڈ رہی تھیں۔ آپ خود ہی شبلی صاحب کے منہ کی بات بتا رہے ہیں کہ امام جعفر علیہ السلام ہی وہ صادق معلم آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں والد امام باقر علیہ السلام کی طرح، جن کی شاگردی کا ابوحنیفہ کو شرف حاصل ہوا، اس چھوٹے سے اقتباس میں تین بار۔

(پروفیسر امیر علی نے اپنا سر جھکا لیا اور مولوی حامد رضا بولے:)

مولوی حامد رضا: اس بحث میں تو ''حدیث کا مقام'' ہی بدل جاتا ہے۔ حدیث کی سند اُمت کے ہاتھ سے نکل کر اہل بیت علیہم السلام کے سلسلہ میں آ گئی۔

سیّد درویش: اس میں چونکنے والی کون سی بات ہے؟ آئمہ اہل بیت علیہم السلام کا سلسلہ ذہبیہ اتنا مربوط ہے کہ حدیث کی روایت میں کڑی ٹوٹتی ہی نہیں۔ ہر امام آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث یوں چلتی ہے: میرے والد علیہ السلام کو اُن کے والد علیہ السلام نے بتایا؛ اُنھوں نے اپنے والد سے سنا: حتیٰ کہ حدیث ابوالائمہ علیہم السلام، حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام تک پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ اب جونہی حدیث ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنا مقام بدلے گی تو یہ تبدیلی اُس کی نوعیت میں بھی آتی جائے گی۔ پہلے یہ ''اجتہاداتی'' تھی اور اب اس کو ''نص'' کا مقام حاصل ہو جائے گا۔

مولوی حامد رضا: کیا نص کا مقام آیت کے سوا حدیث کو حاصل ہو سکتا ہے؟

سیّد درویش: عقل، آیت اور حدیث کو آپ کیسے ایک دوسرے سے توڑ کر جُدا جُدا کر سکتے ہیں؟ یہ تو حق کے منشور کی تین جہتیں ہیں۔ اس منشور میں سے گزرنے والی حق کی روشنی سے جو طیف حاصل ہوتی ہے، اُس کے یہ ہی تین بابرکت رنگ ہوں گے۔ ہاں! اگر کسی کو عقلی ہذیان، یرقان یا پھر Daltonism کا مرض لاحق ہے تو اس کا رنگوں کے ''ہونے'' سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ رنگوں کا ''ہونا'' ہی نص کہلاتا ہے۔ اگر آنکھ میں اخذ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تو وہ علیٰحدہ بات ہے۔

مولوی حامد رضا: آپ حدیث کو اس منشور کی روشنی میں عقلی طور پر قرآن کی روح سے نص ہونا ثابت کریں گے؟

سیّد درویش: فرض کیجئے کسی شخص نے ایسا منظر دیکھ لیا جو اُس کیلئے نہایت نفرت

انگیز اور ناقابلِ قبول تھا۔ اُس کے احساسات اتنے منفی طور پر متاثر ہوئے کہ جن آنکھوں سے اُس نے وہ دید کیا، اُن سے اُس نے رخصت حاصل کر لی۔ اُسے آنکھوں کے وجود ہی سے نفرت ہوگئی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اُس نے دیکھا تھا، اُس کی حقیقت تو بالکل اُس کی سوچ کے برعکس نکلی۔

اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ یہ کیا ہوا، کیا ہونا چاہیے تھا؟

مولوی حامد رضا: جس طرح حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ بعض اوقات آنکھیں اپنے ہی اشخاص سے دھوکہ کر جاتی ہیں، تب اپنی عقل کو بروئے کار لانا چاہیے۔ چنانچہ اُس نے عقل کو خیر باد کر کے نہایت جلد بازی سے کام لیا اور آنکھوں جیسی نعمت کو برباد کر ڈالا۔ آنکھیں تو بیماری، کمزوری یا نشہ آوری کے باعث بھی فریب کُن ثابت ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس کا علاج کروانا چاہیے، یا ضروری پرہیز کرنا ہوگی۔

سیّد درویش: آپ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ شخص عقلی مریض تھا۔

مولوی حامد رضا: جی بالکل وہ درحقیقت تجزیہ و تحلیل کی لیاقت سے ہی فارغ تھا۔ اسی لیے بے عقل نے آنکھوں جیسی نایاب نعمت کو ہی جھٹلا دیا۔

سیّد درویش: کیا اُس کے دماغ میں کوئی سوچ کارفرما تھی؟

مولوی حامد رضا: اُسی غیر معقول سوچ ہی نے تو اُس کی بینائی کا ستیاناس کر دیا۔

سیّد درویش: مطلب آنکھ وہی، لیکن سوچ غلط۔ تو جو سوچ سچ کی جگہ جھوٹ کو حقیقت بنا کر حق کی منکر ہو جائے، وہ اصلاً عقل کہلوانے کے لائق ہو سکتی ہے؟

مولوی حامد رضا: یہ ظلم ہے۔

سیّد درویش: ایسی جعلی، جھوٹی اور اصل نما یعنی نقلی سوچ، چشم تباہ کُن کو کیا کہیں؟

مولوی حامد رضا: یہ عقلِ حقیقی نہیں بلکہ حقیقت کا قیاس ہوگا۔

سیّد درویش: تو پھر عقل کا کیا کام ہوا، حقیقت شناسی یا قیاس آرائی؟

مولوی حامد رضا: حقیقت شناسی۔

سیّد درویش: معلوم ہوا عقل اور ہے، قیاس اور ہے۔ اس قیاس، حقیقت ناشناسی نے ''عقل کی آنکھیں'' پھوڑ دیں۔ اب بتائیں مولوی صاحب! آپ زندگی میں حقیقت اور حق شناسی کیلئے تعقل کریں گے یا قیاس؟

مولوی حامد رضا: (ہنستے ہوئے) آپ کیوں میری آنکھوں کے پیچھے ہو گئے ہیں؟

(پروفیسر صاحب اور سیّد صاحب بھی قہقہہ دار ہنسنے لگے!)

سیّد درویش: معلوم ہوا کہ عقل اور قیاس کی راہیں ہی الگ الگ ہیں۔ دو علیحدہ Pathways ہیں۔ اوّل الذکر کا کام ہے: حق شناسی، آخرالذکر کا......

مولوی حامد رضا: آنکھوں کی بربادی۔

سیّد درویش: یہ آنکھ کیا ہے؟

مولوی حامد رضا: جو خبر دے۔ جو عقل کیلئے شناسائی کا ایک بصارتی وسیلہ ہے۔

سیّد درویش: آنکھ اگر خراب ہو جائے تو تعقل کا کام ہے اس کی اطلاع میں درستگی لانا۔

مولوی حامد رضا: یقینا۔

سیّد درویش: کیوں؟

مولوی حامد رضا: تاکہ قیاس سے بچ جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اسے ضائع کر دے۔

سیّد درویش: کیا حدیث بھی آنکھ کی طرح خبر نہیں دیتی؟

مولوی حامد رضا: بات تو ٹھیک ہے۔

سیّد درویش: کیا حدیث کو ہم آنکھ مان سکتے ہیں؟

مولوی حامد رضا: ایسا ہی ہے۔

سیّد درویش: اگر آنکھ حقیقت پر مخبر ہے تو حدیث کا کام حق کی خبر دینا ہے۔ بس آنکھ کا مقصد ہے ''حقیقت شناسی'' تو حدیث کا مطلب ہوا: ''حق شناسی''۔ مقصد پورا ہونا نہ ہونا الگ معاملہ ہے۔ ''ہونے'' اور ''چاہیے'' کی یہاں بحث نہیں۔

مولوی حامد رضا: صحیح بات ہے۔

سیّد درویش: اچھا ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنکھ ایسی مہلک مرض میں مبتلا ہوگئی کہ اس کو نکال دینا ناگزیر ثابت ہوتا ہے۔ آنکھ کا مقصد ہی فوت ہو گیا، بلکہ اب اُس کا ہونا مزید خرابیاں پیدا کرے گا۔ اس کو Enucleation کہتے ہیں۔ جیسے بعض اوقات مریض کی جان بچانے کیلئے اُس کا کوئی عضو کاٹنا پڑ جاتا ہے۔

مولوی حامد رضا: جی ایسا ہوتا ہے۔

سیّد درویش: تو یہ بات طے پا گئی کہ آنکھ اگر مقصد کے منافی ہو تو بے کار ہوگئی۔ اگر معاون، تو مفید واسطہ ہے۔ تو آنکھ عقل کیلئے خبر کا وسیلہ ہے۔ آنکھ کے پیچھے آنکھ والا ہے۔ پس حدیث کے پیچھے وہ محدث اس کی خبر میں فعال ہے عقل کیلئے، جس کا سچ ہمیں اس میں تعارف بن کر ملے گا۔ پس حدیث اور محدث، حدیث کا سچ اور محدث کا عقلی تعارف جدا جدا نہیں۔

مولوی حامد رضا: آپ کے کلام کی گہرائی کا میں ابھی بھی اندازہ نہیں کر پایا۔

سیّد درویش: عقل متلاشی ہے ایسی حدیث کی جس کا بیان کرنے والا صادق، حقیقت شناسی کے مقصد کو پورا کرتا ہو۔ پس ''ہر'' حدیث نہیں بلکہ ''وہ'' حدیث ہی مستند کہلوانے کی حق دار ہوگی جس کا مخبر حقیقت شناسی کی خبر میں صادق ثابت ہو۔

مولوی حامد رضا: لیکن آیاتِ قرآنی کے علاوہ کوئی دوسری خبر مسلمان کیلئے کیسے حجت قرار پا سکتی ہے؟ قرآن ہی سراپا حق ہے۔

سیّد درویش: اور قرآن کیا کہتا ہے کہ غور وفکر کرو، تعقل کرو، حق کی تلاش کرو آیات میں۔ تو کیا یہ ہی حدیث کا مقدمہ، تلاشِ حق کیلیئے خبر، عقل والوں کو دعوت نہیں دیتی؟

یہ حق شناسی تو عقل کا مسلّمہ مقدمہ اور اُس کی فطرت ہے۔ اللہ عقل کو ہی مخاطب ہے اپنی کتاب میں امرونہی کیلیئے۔ احمقوں کو آیات سے کیا لینا دینا؟ مولوی صاحب کیا یہ آیات خود بھی احادیثِ نبوی نہیں؟ کیا رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حدیث کے خود اوّلین محدث نہیں؟

مولوی حامد رضا: میں کچھ سمجھا نہیں۔

سیّد درویش: حدیث کیسے کہتا ہو؟

مولوی حامد رضا: جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے۔ جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ اقدس سے جاری ہوتا۔ وہ الفاظ۔

سیّد درویش: اچھا قرآن آیات کے الفاظ میں کس کی زبان سے جاری ہوا؟

مولوی حامد رضا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی زبان سے۔

سیّد درویش: آپ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''کی ہی'' زبان سے۔ تو قربان جاؤں میں آپ کی سادگی پر۔ جب یہ بھی مانتے ہو کہ کلامِ الٰہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لسانِ صدق سے ہی جاری ہوا۔ اور جو زبانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکلے وہ حدیث ہے، تو پھر قرآن کے اپنے ہی بتاتے ہوئے نام ''احسن الحدیث'' پر اعتراض کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

مولوی امیر علی: خدا لگتی کہتا ہوں کہ میں نے قرآن کو کبھی اس کے نام ''احسن الحدیث'' ہونے کی بابت سمجھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ آپ کی بات میں اس حقیقتِ قرآن کے پہلو کو سمجھنے کیلیئے بڑا وزن ہے۔

اگر کوئی احادیث کے معاملے میں خیانت برتتا ہے، تو میرا خیال ہے اس میں قرآن کے احسن الحدیث ہونے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

سیّد درویش: بالکل ویسے ہی جیسے مسیلمہ کذاب جھوٹی آیات بولنے والا جھوٹا نبی تھا۔ اسی لیے جھوٹی احادیث بیان کرنے والا، خود جھوٹا محدث ہی ہوگا۔ لیکن نہ جھوٹا نبی، رسول اللہ ہوسکتا ہے، نہ جھوٹی حدیث، احسن الحدیث۔

مولوی امیر علی: جی بالکل سونے کی بات ہے، جو پیتل نہیں ہوتا۔ لیکن ہم کیا سچی احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آیات کہہ سکتے ہیں؟

سیّد درویش: اگر ہم کو قرآن کے احسن الحدیث ہونے پر یقین ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ سے نکلنے والی ہر برحق بات حدیث ہی ہوگی۔ باقی جہاں تک لفظ آیت ہے تو اس کا مطلب ہے: نشانی۔ تو اللہ نے اپنی نشانیاں صرف قرآن میں ہی تو نہیں دیں۔ بلکہ ہمارے نفوس اور آفاق میں ربِّ کائنات نے آیات غور وفکر کیلئے دی ہیں۔ مطلب اللہ کی نشانی ہونا فقط نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکتوبی یا زبانی الفاظ تک محدود نہیں۔ بلکہ عقل کیلئے ہر چیز آفاق اور نفسوں میں اُس خدا یکتا کی طرف آیت، اشارہ کر رہی ہے۔ لیکن آیات کو اس کے اصل معنوں میں سمجھنے کیلئے عقل شرط ہے۔ یہ ہی مطلب ہے کہ آیات ہیں عقلمندوں کیلئے۔ احمق چوپاؤں سے اللہ اپنی آیات میں مخاطب ہی نہیں۔ جن کی تمام فکر اور حیات کی کاوشیں ہیں کہ اچھا کھاؤ، اچھا رہو اور نسل بڑھاتے جاؤ۔

(پروفیسر امیر علی جو بڑی گہری خاموشی سے گفتگو کے مطالعہ میں تھے، کہنے لگے:)

پروفیسر امیر علی: سید صاحب آپ نے فلسفۂ آیات پر باکمال روشنی ڈالی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک، چاند سے لے کر ستاروں تک ہر طرف آیات ہی آیات پھیلی ہوئی ہیں۔ بلکہ سورتیں اس کے نام سے ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ یہ قرآن میں الفاظ کی حقیقت کا آیات میں بدل جانا کیا ظاہر کرتا ہے؟ یہ حقیقت،

الفاظ، آیات میں کیا نسبت ہے؟ کیوں لفظ آیت نے خود ہی بتا دیا کہ الفاظ میں حقیقت کی طرف اشارہ تو ہے، لیکن خود اشارے حقیقت نہیں ہوا کرتے۔

سیّد درویش: یہ جو ہم لوگ قرآن سنتے، پڑھتے، لکھتے ہیں؛ وحیِ الٰہی کی مکتوبی صورت ہے۔ یہ وحی کی وہ حقیقت نہیں جو محمد ﷺ کے قلب پر اُترنے والی وہ حقیقی کتاب، سرخ رنگ کی طرح صرف محمد ﷺ کے قلب کی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔ ہم جو الفاظ کی مکتوبی شکل میں سنتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں، اُس اصل کتاب کا سرخ رنگ نہیں۔ پس کتابِ حقیقی محفوظ ہے محمد ﷺ کے قلب میں۔

اب رسول اللہ ﷺ نے اُس کتاب کی حقیقت (مطلب سرخ رنگ) کو بیان کرنا شروع کیا۔ اب حقیقت کی حالت بیان میں بدلنا شروع ہوگئی۔ کتاب کی حقیقت اب ملفوظی صورت اختیار کرنے لگی۔ اب ہمارے علم میں دو کتابیں آ گئیں: ایک کتابِ حقیقی تو دوسری کتابِ ''ملفوظی''۔ وقت کے ساتھ ساتھ الفاظ کو صحابہ کرامؓ قلمبند کرتے رہے اور آخرکار وحی مکتوبی سانچے میں ڈھال دی گئی۔ یعنی تیسری کتاب کی صورت ''مکتوبی'' کہلاتی ہے''۔

پروفیسر امیر علی: یعنی کتاب کی تین صورتیں ہوئیں: حقیقی، ملفوظی اور مکتوبی۔

سیّد درویش: تین ہی کیوں، چوتھی ابھی باقی ہے، جو اصل میں دوسرے نمبر پر آتی ہے، لیکن میں نے آسانی واسطے چھوڑ دی۔

پروفیسر امیر علی: وہ کون سی؟ اور اُس کی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے؟

سیّد درویش: کوئی سرخ رنگ دیکھے نہ دیکھے، سرخ رنگ کا وجود تو ہے؟

پروفیسر امیر علی: بالکل ہے۔

سیّد درویش: بس یہ سرخ رنگ کا موجود ہونا ہی ''کتاب وجودی'' ہے۔

پروفیسر امیر علی: میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے یہ کتابِ وجودی سمجھائیں۔

سیّد درویش: کئی انبیاء علیہم السلام آئے، جنہوں نے حالات کے مدنظر وحیٔ الٰہی کو کھلم کھلا بیان کیا نہ وہ قلمبند کی گئی۔ اب کتاب تو نبی علیہ السلام کے پاس ہوتی ہے۔ ایسے انبیاء علیہم السلام اپنے اعمالِ صالحہ سے لوگوں کی تربیت کرنے پر مامور تھے۔ تو نبی علیہ السلام کے ہونے میں کتاب کا وجود؛ حقیقی کتاب کا نبی علیہ السلام کے ہونے میں: کتاب وجودی کہلائے گا۔ اگر ابھی سمجھ نہ آئے تو قرآن میں وہ آیت جا کر خود ہی پڑھ لینا، جو عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے اپنی ماں کی پاک گود میں تلاوت کی: ''میں اللہ کا عبد ہوں۔ میں اللہ کا نبی علیہ السلام ہوں۔ میں اپنے ساتھ کتاب لایا ہوں''۔ تو پہلی کتاب حقیقی، دوسری کتاب وجودی، تیسری کتاب ملفوظی، چوتھی کتاب مکتوبی۔

تو آیت وہ علامت ہوئی اپنے مستند ہونے میں جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبانی کتابِ حقیقی میں حق شناسی کی طرف اشارہ دے جو ملفوظی کا مقصد ہو۔ پس حقیقت کا ملفوظی ہونا، احسن الحدیث ہے اور علاماتی ہونا، قرآن۔ اب ہمارے پاس قرآن کی چہار صورتیں ہیں۔ یاد رہے چار صورتیں، نہ کہ چار الگ الگ حقیقتیں: حقیقی، وجودی، زبانی، اشاراتی۔

پروفیسر امیر علی: اس طرح تو کتاب کی حقیقت بدلتی گئی۔

سیّد درویش: کیا ایک ہی شخص مختلف رنگوں کے آئینوں میں اپنی حقیقت کھو بیٹھے گا؟ نہیں! چنانچہ صورت کا مطلب ہی یہ ہے کہ کتاب کی حقیقت وہی رہتی ہے، نوعیت بدلے گی۔ عقول کی مختلف سطحوں پر وہی حقیقت الگ الگ نوعیت میں مخاطب ہوتی ہے، مثلاً ایرانی کورشِ اعظم یونانیوں کیلئے Cyrus تھا۔ حالانکہ اُس کی شخصی حقیقت ایک ہی تھی۔ لیکن ایرانیوں کیلئے اُس کی نوعیت جو تھی وہ یونانیوں کیلئے اور تھی۔ اب کمال کی ناسمجھی ہے جو ایک ہی محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو قرآن میں تو معصوم نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مانے لیکن حدیث میں غیر معصوم بشری۔

حالانکہ عقول کے مطابق حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی نوعیت میں بدلتی ہے، اصلیت

تبدیل نہیں ہوتی: جیسے حقیقی کتاب کی وجودی، ملفوظی اور مکتوبی صورتوں میں نوعیت سمجھنے سمجھانے کی خاطر تو بدل جاتی ہے لیکن اصلیت قائم رہے گی۔

اسی لیے امام حسین علیہ السلام نے قرآن فہمی کے چہار درجات بیان کیے ہیں: پہلا، عبارت کا۔ دوسرا، اشارے کا۔ تیسرا، لطائف کا۔ چوتھا، حقائق کا۔

پروفیسر امیر علی: اس قولِ عظیم کے کیا معنی ہیں؟

سیّد درویش: میری کیا مجال کہ میں معنی بتا پاؤں۔ اپنی سمجھ ہی بیان کروں گا۔ ظلم پر میں یقین کرنے والا شخص نہیں۔ اور حق کو جنابِ عالی مقام علیہ السلام کی طرف لوٹا دوں گا۔

پہلے ہم عبارت کی سطح کو سمجھتے ہیں۔ دیکھیں ہمارے تمام علوم جن کا ماخذ حسّی تجربہ جو Empirical Experience کہلاتا ہے، ہوتا ہے۔ ایجادات سے لے کر تفاسیر تک، سب ظاہری عبارت تک محدود ہیں۔ ان علوم کی حیثیت سمندری لہروں سے زیادہ کچھ نہیں جو ظاہر میں متصادم اور تضادات و مفاہمات سے پُرآشوب ہیں۔ (ii) اشاراتی مقام وہ جو ظاہری عبارت کی لفظی سطح سے بلند ہوتا ہے۔ یہاں لفظ کی نوعیت اشارے میں بدل گئی۔ میں نے اشارے کا لفظ استعمال کیا ہے، تمثیل کا نہیں۔ کیونکہ اشارے کا معرفت سے تعلق ہوتا ہے، تصوف سے اس کا کوئی لینا دینا نہیں۔ یہ حقیقت بھی ملحوظِ خاطر رکھی جائے کہ ایک ہی اشارے کے کئی کئی غلط مفہومات نکال لینے پر جنگیں شروع ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر کسی خوبصورت دوشیزہ نے دُور سے اپنے محبوب کو اشارہ کیا جہاں بدقسمتی اُس کی کہ دو سو اور بھی کھڑے اُس کو ٹک ٹکی باندھے تاڑ رہے تھے۔ اب کم از کم 50 نے سمجھ لیا کہ وہ مطلوب ہیں۔ بقیہ جات شریف النفس، اصل ایک کو چھوڑ کر، 149 ساری عمر خوش فہمی کے آئینے میں نرگس کے پھول کی مانند اپنے آپ کو بہلاتے رہیں گے۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ اشارہ صرف اہل معرفت کو ہی ہوتا ہے، یا کہہ لیں عقلمندوں کو کہ وہ معرفت حاصل کریں۔ عبارت والوں کیلئے اشاراتی صورت غلو ہی ہونی چاہیے۔

پروفیسر امیر علی: معذرت کے ساتھ یہاں میرے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اشارہ، اہلِ عبارت کیلئے غلو کیوں ہونا چاہیے؟

سیّد درویش: مقرر کردہ حد سے تجاوز کرنا غلو ہے۔ کسی شخص نے مرغی تلے بطخ کے بھی دو انڈے رکھ دیئے۔ بچے نکل آئے۔ اب ہونا کیا تھا، تالاب ساتھ ہی تھا مرغی نے چلّانا شروع کر دیا جونہی بطخ کے بچوں نے تالاب کی طرف تیزی سے دوڑ کر غلو کرنا شروع کیا۔ اب مرغی کیلئے تالاب غلو کی دُنیا، غلو کی علامت ہے۔ بطخ فطرتی طور پر تیرنے کے قابل ہے۔ جبکہ مرغی قاصر ہے۔ بطخ کہتی ہے: میری تقصیر نہ کرو، کیونکہ میں تیر سکتی ہوں۔ مرغی اپنے جذبات میں عقلی پریشان ہے کہ پانی کی طرف غلو نہ کرو، ورنہ ڈوب جاؤں گی۔ پس مرغی کیلئے تالاب نہیں ہوتا، کیونکہ وہ بطخ نہیں۔

اب سوئم درجہ آ گیا لطائف کی دنیا کا۔ دیکھیں یہ کوئی فنا کی دنیا نہیں۔ یہاں ہوش وحواس کو فنا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تو فکری لطافت کی سطح ہے۔ یہاں مادی کثافت غائب ہو جاتی ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی دنیا ہے۔ غیر انبیاء علیہم السلام اشاراتی دنیا تک محدود رہتے ہیں۔

آخر میں چوتھی سطح آ گئی حقائق کی، حقیقت کی دنیا کیا ہے، وہ ہمارے جیسے محتاجِ تجربات، غیر معصوم کے جاننے کی تکلیف ہی نہیں، اور نہ ہی برداشت ممکن ہے۔

پروفیسر امیر علی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب آخری حج ادا کیا تو فرمایا کہ اگلے سال وہ اُن کے درمیان نہ ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ اب کون ہوگا جو آیاتِ قرآنی کی تشریح کرے گا؟ سلسلہ ہدایت تو قیامت تک چاہیے۔ میں آپ کی قرآن پر بحث کے منطقی نتائج سے متفق ہوں۔ لیکن حقیقی اُمورِ حیات میں یہ منطقی سچ ثابت ہوتا ہے؟

سیّد درویش: یہ آخری خطبہ آپ کو قرآن میں ملا ہے؟

پروفیسر امیر علی: نہیں۔

سیّد درویش: تو کیسے پتہ چلا؟

پروفیسر امیر علی: حدیث نے بتایا۔

سیّد درویش: اچھا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جا رہے ہیں۔ حدیث بتا رہی ہے۔ تو عقل کا فطرتی سوال فوراً کیا بنتا ہے؟

پروفیسر امیر علی: عقل یہی پوچھے گی: یارسول اللہ تو ہم قرآن کی تعلیمات میں حکمت اور احکام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کس سے پوچھیں گے؟ کون مراجع ہوں گے؟

سیّد درویش: اچھا آپ خود ہی فیصلہ کریں، کن کی طرف رجوع کرنا چاہیے؟

پروفیسر امیر علی: جو قرآن کے وارث ہوں گے، لیکن پھر وہی سوال آ گیا کہ وہ کون ہو سکتے ہیں؟

سیّد درویش: وارث ہوتا ہے یا زبردستی بھی بن سکتا ہے؟

پروفیسر امیر علی: وارث ''ہونے'' اور وارث زبردستی بن جانے میں بنیادی فرق ہے۔ وہ ''غاصب'' کہلائے گا۔

سیّد درویش: پس قرآن کے وارث تو وہ ہی قرار پا سکتے ہیں جن کو اللہ کہے کہ یہ میرے تاقیامت قرآن کے وارث ہیں۔ مجھے بتائیں کہ کیا قرآن نے کہا کہ اُس کے وارث ہیں؟

پروفیسر امیر علی: بالکل قرآن کہتا ہے۔

سیّد درویش: تو قرآن نے اعلانِ عام کر دیا کہ وہ لاوارث نہیں۔ خبردار! کوئی غیروارث اس کی وراثت کا دعویدار ہو کر اپنے اوپر ظالم اور غاصب ہونے کی مہر مت لگوالے۔

پروفیسر امیر علی: یہی منطقی نتیجہ نکلے گا۔

سیّد درویش: اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ قرآن کی وراثت کے منطقی قائل ہیں۔

پروفیسر امیر علی: عقل کیلئے تو یہ ہی آیت وراثتِ قرآن چارہ گر ہے۔ جبکہ علماء کرام تو قرآنی فہم و تفہیم کے نام پر ایک دوسرے کے دست و گریبان ہیں۔ ہر کسی کے پاس تفسیر و تشریح کی اپنی معجون ہوتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ان میں سے ہی ایک اصلاح کاری کے نام پر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ نیا داعی سبھی تفاسیر اور تشریحات کو ذاتی آراء اور توہمات قرار دے کر نہایت بے باکی سے مسترد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''قرآن تو عام فہم اور نہایت آسان کتاب ہے۔ ہر کوئی اس سے اپنی اپنی عقل کے مطابق مستفید ہونے کا حق رکھتا ہے۔ تفسیر کا حق صرف علماء کو ہی حاصل نہیں بلکہ ہر کوئی مفسر ہے''۔

سیّد درویش: وہی غالی اور مقصر والی مثال سامنے آ جاتی ہے۔ دراصل یہ لوگ حقیقتِ قرآن کو عباراتی طور پر محدود کر کے عقلِ انسانی کیلئے آیات کی عالمگیر اور باطنی جہتوں کو اُکھاڑ پھینکنے کے درپے ہیں۔ ان ظاہری صلاح پسند سوفسطائیوں کی مثال تو اُن بیلوں اور گھوڑوں کی سی ہے جن کے متعلق یونانی فلسفی ژینوفن کا مشہور مقولہ ہے کہ ''اگر اُن کو ہاتھ عطا کر کے مصوری کا اختیار دے کر پوچھا جاتا کہ اب اپنے اپنے خداؤں کی تصویر کشی کرو، تو گھوڑوں نے اپنا خدا گھوڑا، اور بیلوں نے بیل ہی بنانا تھا''۔ ان حضرات کیلئے ہی تو قرآن نے کہا ہے کہ ''ان کی مثال چوپایوں کی سی ہے، بلکہ ان سے بھی ذلیل''۔ پتہ چلا کہ چوپایوں کے رشتے دار چوپائے ہی ہوں گے چوپائے کا ذکر بھی ایک سا ہی ہوتا ہے، خواہ ژینوفن کرلے یا قرآن۔

پروفیسر امیر علی: لیکن ان لوگوں کا ماننا ہے کہ یہ حدیث اُن کیلئے ہی فرمائی گئی ہے: ''میری اُمت کے علماء کو بنی اسرائیل کے انبیاء پر فوقیت حاصل ہے''۔

سیّد درویش: کوئی اِن خودفریبی میں مبتلا نرگسی حضرات سے پوچھے کہ بنی اسرائیل

کے انبیاء پر تو وحی آتی تھی، تمہارے پاس وحیٔ الٰہی سے بڑھ کر علم کا کون سا ذریعہ ہے؟ وہ تو اللہ کے اُذن سے معجزات کیا کرتے تھے، تمہیں کیا اذن کی بھی ضرورت نہیں؟ نبی علیہ السلام کجا! ہم آصف برخیا ہی کی بات کر لیتے ہیں جو ''کتاب'' کا تھوڑا سا علم جانتا تھا: اُس نے پلک جھپکنے سے قبل تختِ بلقیس کو حاضر کر دیا۔ جب کہ ان حضرات نے معجزہ کیا کرنا ہے، یہ تو سائنسی ایجادات کو سمجھنے سے ہی قاصر ہیں۔ آج تک صوم وصلوٰۃ کے ایک طریقہ میں اکٹھے نہیں ہو سکے، حالانکہ نبی پاک ﷺ کم از کم 20 سال یہ احکاماتِ الٰہیہ دن میں پانچ بار اور سال میں پورا اک ماہ یہ ہی کرتے، سمجھاتے اور دکھاتے آئے۔

پروفیسر امیر علی: آپ کے دلائل سے فرار محال ہے۔ لیکن میں قرآن میں قرآن کے ہی وارثان کو دیکھنے سے قاصر ہوں۔ مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔

سیّد درویش: ریاضی میں لامتناہیت حساب دان کو ہی نظر آتی ہے۔ ریاضی سے ناآشنا کو کیا ملے گی؟ پتھر میں صنم کی صورت مجسمہ ساز دیکھتا ہے۔ میرے جیسے موٹے دماغ واسطے پتھر صرف ٹھوس مادے کی عبارت ہے۔ لیکن سنگ تراش کیلئے اس میں محبوب کی طرف اشارہ پا جاتا ہے۔ یہ تو معاملہ تھا عقلی بصیرت کا۔ اب ذرا حسّی بصارت پر بات کر لیتے ہیں۔ کیا آپ یہاں بیٹھے منگولیا والوں کو دیکھ سن سکتے ہیں؟ نہیں! کیوں؟

پروفیسر امیر علی: کیوں نہیں؟ ہوا میں سب موجود ہیں۔

سیّد درویش: کدھر ہیں؟ مجھے تو کچھ دیکھائی نہیں دے رہا۔

پروفیسر امیر علی: آپ چاہیں تو ابھی نیٹ پر دیکھ اور سُن لیں، بلکہ اُن سے بات چیت بھی کر سکتے ہیں۔

سیّد درویش: آپ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر متعلقہ آلہ ہو تو جو کسی کو ہوا کی عبارت میں نظر نہیں آتا، وہ ہوا کے اشاروں، یعنی موجوں میں ہمارے لیے مرئی ہو جائے گا۔ جس کے پاس آصف برخیا والا اشاراتی عقل پر مبنی آلہ نہیں: ساری کتاب ساری عمر حفظ

اور مطالعہ کر کے جاننے کا دعویٰ دار ہونے کے بعد بھی معجزات کی صلاحیت ہی نہیں حاصل کر سکا؛ تو اُسے بھلا کیا مصیبت پڑی ہے کہ خواہ مخواہ اہلِ تصرف کی ہمسری کرتا پھرے؛ اپنے آپ کو اُن کے علمی مقام کو جھٹلانے کا حق دار سمجھے: وارثِ کتاب ہونا تو دُور کی بات!

پروفیسر امیر علی: اس کا مطلب صاف ہوا کہ قرآن میں غیر مرئی وارثانِ کتاب کو دیکھنے کیلئے معیاری بصیرت چاہیے۔ اس میں قصور قرآن کی عبارت میں نہیں، بلکہ اُس کم عقلی کا ہے جو اس میں آیات کے اشاروں کو سمجھنے سے قاصر ہے اور جھٹلاتا بھی ہے۔ صلاحیت اپنے اندر نہ ہونا، اور جھٹلانا اہلِ نظر کو، سراسر ناانصافی اور غیر اخلاقی رویہ ہے۔

سیّد درویش: اب ہم آگے بڑھتے ہیں۔ آپ کیا قرآن کو تاقیامت سرچشمہ ہدایت مانتے ہیں؟

پروفیسر امیر علی: جی ہاں۔

سیّد درویش: جب قرآن ہدایت ہے تاقیامت؛ تو لازماً اس کے وارث بھی موجود ثابت ہوں گے تا وقتِ آخرت۔

پروفیسر امیر علی: بات میں وزن ہے لیکن سیّد صاحب وارث ہونے سے آپ کی قطعی مراد کیا ہے؟

سیّد درویش: بڑا زیرک سوال ہے! آپ نے کیوں پوچھا؟

پروفیسر امیر علی: اگر قرآن مخصوص ہو گیا وارثوں میں، تو اُن کے علاوہ کوئی دوسرا عالم نہیں رہے گا۔ سبھی قرآن کی رُوح سے طالبِ علم ثابت ہو جائیں گے۔

سیّد درویش: بہت خوب! آپ نے میری اُمت کے علماء والی حدیث پر کبھی اپنے ہی سوال کے نقطۂ نگاہ سے غور کیا ہے؟ علماء رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ''میرے'' ہونے میں شامل ہیں۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے، اپنوں میں ہیں۔ اُمت ''میرے'' والے دائرے

سے باہر ہیں۔ جیسے چرواہا بھیڑوں میں شامل کوئی خود بھیڑ نہیں ہوتا۔

اچھا آپ کو لفظ وارث کی جگہ ''وراثت'' لگا کر سوال لوٹا رہا ہوں۔ آپ کی وراثت سے کیا مراد ہے؟ آپ وراثت کی تعریف کریں، میں آپ کو وارثِ قرآن دیکھا دوں گا۔

پروفیسر امیر علی: مالک کا اپنے بعد اپنی ملکیت کو اپنی فطرتی اولاد کی طرف منتقل کر دینا۔

سیّد درویش: آپ نے ''فطرتی اولاد'' کا بڑا جامع لفظ استعمال کیا ہے۔ مطلب اگر منتقل کیے بغیر مالک خود انتقال بھی کر گیا تو ملکیت منتقل قرار پائے گی۔ کیوں ایسا ہی ہے؟

پروفیسر امیر علی: جی بالکل اُسی طرح جیسے موروثی جین نسل در نسل انتقال کرتے جاتے ہیں۔

سیّد درویش: میرا سوال اب یہ ہے کہ وراثت انتقال سے پہلے ملکیت ہونا ضروری ہے؟

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب اس سوال کا کیا تُوک بنتا ہے، کیونکہ جب ملکیت ہی ثابت نہ ہو تو وراثت کیسی؟ مالک نہیں تو وراثت کس کی کس کو؟

سیّد درویش: یعنی وراثت بعد میں، پہلے ملکیت ثابت ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ مالک اور وارث کی نسبت میں ملکیت کا حقدار کو منتقل ہو جانا رُوحِ وراثت ہے۔ غیر حقدار کے قبضے میں یہ ''غصب'' کہلائے گی۔ وراثت اور ہے، غصب اور ہے۔ وارث ہوتا ہی ہے مالک کی ملکیت کا اصل مستحق۔ وراثت پس عدل ہے۔ جبکہ غصب، ظلم۔ مثلاً کتاب کا وارث، عالم، تلوار کا وارث، جنگجو۔ کیا فطرتی تعلق ہے!

پروفیسر امیر علی: اگر اولاد اہل نہ ہو تو؟

سیّد درویش: دو صورتیں ہیں: عاق کر دو، ورنہ جین کی مانند منتقل ہو جائے گی۔
لیکن میرا عالم اور جنگجو کی مثال دینے کا مقصد، اہلیت اور وراثت میں مالک کی خوشنودی اور دعوے کے جائز حق کو جتلانا تھا۔

میں آگے چلوں؟ وراثت والا معاملہ صاف ہو گیا؟

پروفیسر امیر علی: جی ضرور سیّد صاحب یہ کاذبین اور ظالمین کون ہیں؟

سیّد درویش: ہر وہ جو قرآن کی وراثت کا جھوٹا دعویدار ہو، کذاب ہو گا۔ اور اپنے اس جھوٹے دعویٰ میں وارث کی جگہ زبردستی لینے والا وہ جھوٹا، ظالم کہلوائے گا۔ ایسے جھوٹے اور ظالم غاصب پر، جو اللہ کی کتاب کو لاوارث گمان کر بیٹھا، اور اب اُس کے جی میں جو آتا ہے، اپنے مطالب اور مفادات کی جاہلانہ توجیہات میں آیاتِ قرآنی سے ناجائز سلوک کرتا ہے، لعنتِ الٰہی صادر ہو گی۔

پروفیسر امیر علی: یعنی نظامِ ہدایت، کتابِ الٰہی کی صورت میں لاوارث نہیں بلکہ اس کے باقاعدہ وارث ہیں جو ہر زمانے میں ہادی اپنی وراثت کے محافظ ہیں۔

سیّد درویش: اب آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ قرآن میں اللہ نے ہدایت کو قیامت تک کتاب کے وارثوں میں تو محفوظ کر دیا، لیکن وحی بھیجنے والے کے یہ علم میں نہ تھا کہ وہ وارث کون اس کے اہل ہوں گے؟ انتخاب تو وہ کرے گا جس کے متوازی اُس کے علاوہ دنیا موجود ہو۔ خالق اور انتخاب کو یہاں ضدوں میں کیوں اکٹھا کرنے پر بضد ہو؟ آپ کا کیا خیال ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے کی خاطر وہ تاریخ انسانی میں اُمیدواروں کی تلاش کے تجربات میں اہلیت والوں کو ڈھونڈتا پھرے گا؟ کیا وہ کوئی ہیگل کا خدا تھا جو فطرت میں اپنی تحلیلِ ذات کرتا پھرتا ہے؟

پروفیسر امیر علی: اللہ تو اپنی ذات میں علیم اور حکیم ہے۔ وہ کیوں انتخاب کے جاہلانہ تجربات کرے گا؟ وہ کس کا جواب دینے کا پابند ہے؟ عدل تو اُس کی فطرت ہے!

سیّد درویش: آپ نے خود ہی بتا دیا کہ انتخاب کی ضرورت تو تب ہے اگر خالق کے علیم ہونے میں کوئی شک گزرے۔ جبکہ وہ قرآن، اپنے ذکر کو ایسے اہل وارثوں کے حوالے کر چکا کہ اُس نے اطمینان کر لیا، اب قرآن قیامت تک محفوظ ہے۔ اور قرآن کوئی 23 سالوں میں یہ فیصلہ نہیں کر رہا، بلکہ لوح و قلم کے عالم کی بات ہے۔

اب قرآن منتقل ہوا، لوح و قلم والا قرآن، وہ ہی حقیقی کتاب جسے سورۃ بقرہ میں کہا کہ جو ''ال م'' وہ کتاب ''ذالک الکتاب'' ہے؛ اللہ کی طرف سے جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب پر۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کی ملکیت کس طرح خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف طولی انتقال کر رہی ہے! جونہی زمین پر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منزل آ پہنچی، طولی ملکیت پر مہر نبوت دال ہو گئی اور آج کے بعد وہ عرضی وراثت میں بدل گئی۔ کتاب وہی، کتاب کی حقیقت نہیں بدلی؛ البتہ وحی کی نوعیت زمین والوں کی سمجھ کے مطابق عرضی صورت میں ڈھل گئی۔ یعنی نبوت کا دورِ تنزیل ختم ہو گیا اور ولایت کا دورِ تاویل شروع ہو گیا۔ کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسا عالم ہے جو اس بات کا دعویدار ہو کہ وہ قرآن کا وارث ہے کیونکہ قرآن اُس کے باپ کی ملکیت تھی؟

پروفیسر امیر علی: میری نگاہ میں تو ایسا کوئی دعویدار نہیں گزرا۔

سیّد درویش: اگر ہو تو؟

پروفیسر امیر علی: اپنے دعویٰ میں وہ سچا ہو سکتا ہے اور جھوٹا بھی۔

سیّد درویش: جھوٹا ہوا تو کذاب پر لعنت، اور اگر سچا نکلا تو؟

پروفیسر امیر علی: بے شک وہ صادق ہو گا۔

سیّد درویش: دیکھا حدیث میں بھی ہم صادق کے متلاشی ہیں اور اب قرآن میں بھی صادق ہی چاہیے۔ اچھا اگر ایک کی بجائے کئی اور ہر کوئی صادق ہو تو؟

پروفیسر امیر علی: وہ صدیقین ہوں گے۔

سیّد درویش: کیا اللہ خود قرآن میں نہیں کہتا کہ ’’صدیقین کے ساتھ ہو جاؤ؟‘‘

پروفیسر امیر علی: جی قرآن میں صدیقین کا یہ ذکر ہے۔

سیّد درویش: اچھا یہ بتائیں کہ قرآن المبین میں ہر چیز کا قیامت تک علم ہے؟

پروفیسر امیر علی: جی!

سیّد درویش: تو جو قرآن کا مالک ہو، جسے قرآن کی ملکیت اللہ کی طرف سے منتقل کر دی گئی ہو وہ علم کا حصول کیلئے محتاج ہوگا؟ اُس کو علمی اضافوں کے کسب کی ابھی بھی ضرورت باقی ہونی چاہیے؟

پروفیسر امیر علی: یہ امر عقلاً تو محال ہے۔لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو قرآن میں اُمّی کیوں کہہ کر پکارا گیا ہے؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر وحی تو 40 سال بعد آئی۔

سیّد درویش: اُمّی کا مطلب یہاں ’’اَن پڑھ‘‘ ہونا ہرگز نہیں۔ ایک لفظ کے کئی معانی ہوتے ہیں۔ ہمیں حقیقت کے بیان اور اپنی سوچ کی ادائیگی واسطے، اُس کیلئے لفظ کو درکار معنوں میں استعمال اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو ایک لفظ کے دوسرے معنی معلوم ہی نہیں، تو یہ اُس کا اپنا علمی فقدان ہے۔

پروفیسر امیر علی: تو سیّد صاحب پھر اُمّی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبت کیا معانی بنتے ہیں؟

سیّد درویش: اس کا مطلب ہے: ’’مکے کا باسی‘‘۔

پروفیسر امیر علی: وہ کیسے؟ مکہ تو شہر کا نام ہے۔

سیّد درویش: بالکل صحیح؛ جیسے جوش ملیح آبادی، اقبال سیالکوٹی، امام دین گجراتی۔ مکہ پرانے وقتوں میں ’’اُم القریہ‘‘ بھی پکارا جاتا تھا۔ اس کا مطلب ہے: ’’بستیوں کی ماں‘‘۔ اسی نسبت سے اہل مکہ کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی اُمّی کہلاتے تھے۔ دوسرا یہ کہنا بے ہودہ الزام سے کم نہیں کہ 40 سال قبل از بعثت نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس علم تھا نہ ہی

ایمان۔ ایسی سوچ والے مسلمانوں سے بہتر تو وہ بحیرا راہب تھا، جس نے غیر مسلم ہوتے ہوئے بچپن میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی پر خورشید نبوت کی کرنیں دیکھ کر حضرت ابوطالب علیہ السلا کو کہا کہ اس بچے کو واپس لے جایئے؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تا آخری دم نبوت کے چراغ کو آندھیوں سے بچاتے رہے۔

پروفیسر امیر علی: پھر سورۃ علق میں جبرائیل نے کیوں کہا کہ پڑھو؟

سیّد درویش: اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَن پڑھ ہوتا تو کیوں کہتا: پڑھ؟ اصل سوال یہ ہے کہ کہاں سے پڑھے؟

پروفیسر امیر علی: آپ کی بات میں بڑا وزن ہے: (i) اُمّی کو پڑھنے کا حکم دینا لایعنی ہے (ii) اگر پڑھے بھی تو کیا، مطلب کہاں سے پڑھے گا؟ اللہ، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جبرائیل کے علاوہ تو کوئی تھا نہیں۔

سیّد درویش: اس کا مطلب یہ تھا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! تجھے جو کتابِ حقیقی قبل از تخلیق عطا کر دی چکی ہے، اُس کو ملفوظی صورت میں ڈھالنا شروع کر دے۔ سورۃ علق تو اللہ کی طرف سے اجازت نامہ وصول ہوا تھا۔ کیوں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمال کو قبیح گمان کرنے پر تُلے ہو؟ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ پیدائش سے پہلے میثاق الانبیاء کو سمجھیئے! کتاب نبی کے ساتھ ہوتی ہے وہ پیدائش کے وقت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اُس کتاب کو کتابِ وجودی کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ نہ بولے تو بھی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہونا ہی کتاب پر دال ہے۔

کتابِ وجودی کی عام مثال گلیلو کا قول ہے: ''کہ فطرت کی کتاب ریاضی کے اعداد میں، زبان میں، لکھی ہے''۔ خود قرآن نے بتایا کہ اللہ کی آیات آفاق بھی رکھتے ہیں۔ مطلب علم کا فطری طور پر کسی میں موجود ہونا؛ اُس وجود کو کتابِ وجودی بنا دیتا ہے۔

اب اگر آفاق اپنی آیات میں اللہ کی کتابِ وجودی ہو سکتے ہیں تو نبی علیہ السلام اپنی پیدائش میں کیوں کتابِ وجودی نہیں ہوسکتا؟ کیا وہ اپنے وجود میں کتابِ حقیقی کی ملکیت نہیں رکھتا؟ اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے وجود میں کتاب کا مالک ہی ثابت نہ ہو، تو بنا ملکیت اللہ کیسے قرآن کے وارثان ہونے میں مطلع کرسکتا ہے؟

میں قربان نہ ہو جاؤں اُن احمق پڑھے لکھے سوفسطائیوں کے جو اُٹھ اُٹھ کر ثابت کرتے ہیں کہ انجیل میں لفظ ''فاراقلیٹس'' اصل میں ''پری قلیٹس'' کی تحریف ہے۔ کہتے ہیں اصل لفظ کا مطلب ''احمد'' ختم الانبیاء علیہم السلام کی خوشخبری دیتا ہے۔

اچھا جو احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر دے رہا ہے، اُس کو تو قرآن میں اللہ پیدائشی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کتابِ وجودی کا مالک قرار دے؛ لیکن جس کی خود عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی اللہ پیدائش سے پہلے ہی احمد کے نام سے خوشخبری دے؛ اُس کے پاس نہ کتاب ہے، نہ پڑھے لکھنے کی صلاحیت! تو میرا اِس سب کو سوال ہے کہ عقلمندوں جب پتہ تھا کہ اُمّی ہے تو سورۃ علق میں خود کس علمی بنیاد پر حکم دے رہا تھا کہ پڑھ؟

اصل مسئلہ یہ ہے کہ اِن حضرات کو فلسفۂ نبوت (Prophetology) کا سرے سے پتہ ہی نہیں۔ یہ علم کسب کرنے والے، کتاب رکھنے والے لُدنی علم کے مالک، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے قیاس میں احاطہ کر ہی نہیں سکتے۔ وہی ژینوفن کے گھوڑوں اور بیلوں والی بات یہاں بھی صادر آئے گی۔

پروفیسر امیر علی: آپ نے میرے لیے نہایت اہم مشکل بڑے احسن طور پر حل فرما دی ہے۔ ہم نے اس سے پہلے وراثتِ قرآن کے باب میں یہ نتیجہ پایا کہ طولی ملکیتِ کتاب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد عرضی وراثت میں منتقل ہوگئی۔ ہم متفق ہو گئے کہ حق دار وارث صرف صدیقین ہی ہوں گے۔ ابھی تک وہ آپ سامنے نہیں لائے۔

سیّد درویش: آئندہ آسانی واسطے ایک سوال کا مجھے آپ جواب دیں گے۔

حضرت عزیر علیہ السلام واپس زندہ ہو گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام مردے زندہ کرتے۔ یعنی یہ رجعت کیا حیاتِ نفس پر دال نہیں؟

پروفیسر امیر علی: جی بالکل ہے۔

سیّد درویش: کیا موت کا ذائقہ چکھنے سے نفس بھی مر جاتا ہے؟

پروفیسر امیر علی: نفس مرے گا نہیں، معطل ہوگا۔

سیّد درویش: کیسے؟

پروفیسر امیر علی: انسان کا نفس، روح نکلنے کے بعد جسد سے الگ ہو جاتا ہے۔ الگ ہوتا ہے، ختم نہیں ہوتا۔ نفس کار میں بیٹھا مانند گاڑی بان ہوتا ہے۔ رُوح کا پٹرول ختم ہو گیا؛ گاڑی رُک گئی۔ گاڑی رُک جانے کا یہ مطلب نہیں کہ گاڑی بان کا وجود ختم ہو گیا۔ گاڑی جسم ہے۔ ڈرائیور، مثلِ نفس۔ دوبارہ رُوح کا پٹرول پڑے گا، گاڑی اور گاڑی بان پھر فاعل اور مفعول کے رشتے میں منسلک ہو جائیں گے۔

سیّد درویش: کیا عمدہ تشبیہ دی ہے۔ بس یہاں ہی آپ کو میں لانا چاہ رہا تھا کہ مالک کی رُوح نکل گئی: نفس باقی رہ گیا: اور ملکیت اُس نفسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو وراثت میں منتقل ہو گئی۔

پروفیسر امیر علی: نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ہی نفس کو قرآن، وارث بنا کر منتقل کر دیا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

سیّد درویش: لیجئے میں آپ کی مدد کرتا ہوں۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے انتقال کرنے کا مطلب تھا کہ زندگی کی نوعیت بدل گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زندہ نفس میں ملکیت اب وراثت میں تبدیل ہو گئی۔ دیکھیں جبرائیل علیہ السلام نہ اللہ کا وارث تھا وحی میں، نہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جبرائیل علیہ السلام کے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد قرآن باقاعدہ وراثت قرار پا گیا۔ کیا قرآن خود نہیں کہتا کہ شہید زندہ ہے، باقاعدہ روٹی کھاتا، پانی پیتا ہے۔

لیکن ہمیں اس جہت کا شعور نہیں۔ مطلب ہمیں زندگی کی نوعیت کا، جس میں شہید کا نفس رہائشی ہوتا ہے، کچھ ظاہری تجربہ نہیں۔

پروفیسر امیر علی: ٹھیک۔

سیّد درویش: تو آپ کو پھر یہ ماننے میں بھی دقّت نہیں ہونی چاہیے کہ نبی ﷺ کا نفس بھی چونکہ زندہ ہوتا ہے؛ کھاتا، پیتا، سوتا، جاگتا ہے، لیکن اُس کی نوعیت کا ہم بشری استدلال میں شعور نہیں رکھ سکتے۔ یعنی نبی ﷺ کے نفس کا زندہ وجود ایسا ہوتا ہے جس میں ہم نبی ﷺ کے انتقالِ ملکیت کو وارث کی نوعیت میں نہیں سمجھ سکتے۔

پروفیسر امیر علی: اس کا کیا سبب ہوسکتا ہے؟

سیّد درویش: کیونکہ ہم نبی ﷺ کے نفس کو اپنے بشری تقاضوں میں قیاس کرنے کے عادی ہیں۔ اس کی ہلکی سی مثال دیتا چلا جاؤں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: وہ آلِ داؤد ہیں۔ تو نسل کیا ماں سے چلتی ہے؟

پروفیسر امیر علی: والد سے۔

سیّد درویش: نبی ﷺ جھوٹ بولتا نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام ''روح اللہ'' ہیں۔

پروفیسر امیر علی: اس کا کیا مطلب ہوا؟

سیّد درویش: عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں، کیا آپ کو شعور ہے کہ جو حسّی استدلال میں محال نظر آتا ہے، وہ باقاعدہ زندہ ہے اور مہدی علیہ السلام کی گواہی دے گا؟ تو اللہ نے صریحاً بتا دیا کہ نبی ﷺ کی وراثت کو اپنے اوپر قیاس مت کرو۔ وہ ہمارے جیسے نہیں۔ کیوں مسئلہ پروفیسر صاحب حل ہوا؟

پروفیسر امیر علی: حل کیا ہونا تھا، میری پریشانی مزید بڑھ گئی ہے۔

سیّد درویش: (ہنستے ہیں...... کیا گھر سے کال آرہی ہے؟) کیوں کیا ہوا؟

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب مجھے کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نفس ہی، رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علاوہ کوئی اور غیر نبی ہو، کیسے ممکن ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قرآن کا مالک ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی اپنے نفس میں زندہ رہ کر اب قرآن کا وارث کہلائے؟ میں یہ بھی انکار نہیں کر سکتا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آلِ داوٗد کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ نہ ہی قرآن کے وارث ہونے میں کسی کلام کی گنجائش ہے۔ سوال یہ بنتا ہے کہ جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہاں کوئی نرینہ اولاد باقی نہ تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نفس بعد از رحلتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کس طرح وراثت کی پہلی کڑی ہو گیا؟

(سیّد درویش پھر ہنسے اور بولے:)

سیّد درویش: مجھے پتہ تھا کہ آپ آواگون کی دلدل میں گرنے والے ہیں۔ میں نے اسی لیے عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے آلِ داوٗد ہونے کی مثال دے کر آپ کو قیاس سے نکالنے کیلئے اللہ کی رسّی پھینک دی۔ اصل میں آپ کی حیرانگی یا اعتراض کی علت وہ غفلت بنتی ہے جو آج تک آپ لوگ قرآنی آیات کے مطالعہ میں برتتے چلے آ رہے ہیں۔ حالانکہ نفسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مطلب ہماری خوابیدہ سوچ میں ادراک کی لیاقت کو بیدار کرنا ہے۔

پروفیسر امیر علی: آلِ داوٗد علیہ السلام کی طرح آپ نفس رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کیلئے وراثتِ قرآنی کیسے ثابت کریں گے، جب کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تم میں سے کسی ایک مرد کے باپ نہیں''۔

سیّد درویش: اس آیت میں دو حقائق غور لائق ہیں: (i) لفظ ''ایک مرد'' (ii) ''تم میں سے''۔ دیکھیں لفظ ''تم'' نے بتا دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم والے اور ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم والوں کے علاوہ دوسرے یعنی غیر ہیں۔ پس محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم باپ ہیں لیکن اپنوں میں، غیروں، اُمتیوں میں کسی کے باپ نہیں۔

پھر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے والوں میں باپ ہیں، ایک عورت کی نسبت سے۔ اب اپنے والے وہ ہیں جن کا تعلق اتنا قریب ہو کہ نفس کی نسبت واضح ہو جائے۔ اب اپنے والے ہونے سے پتہ چل گیا کہ جیسا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ویسا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غیر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نفس۔ پس محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باپ ہوئے اپنے نفس کی اولاد کے ایک عورت کی نسبت سے۔

پروفیسر امیر علی: کون ہے وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نفس، جس کی اولاد ایک ہی عورت سے نسبت رکھتی ہو؟

سیّد درویش: جی چلئے میں آپ کو قرآن کے میدانِ مباہلہ میں لے چلتا ہوں۔ اللہ نے دنیا کے تمام مردوں، تمام عورتوں کو چیلنج کر دیا کہ کوئی خود کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والے ثابت کر کے دیکھا سکو۔ اُمت اور اہل بیت علیہم السلام میں ہمیشہ کیلئے تقسیمی خط کھینچ کر رکھ دیا۔ اگر ابھی بھی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نفس، نفسِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نظر نہیں آیا تو سنو آیتِ مباہلہ کا اعلان: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کہہ دو ان (نجران کے عیسائی وفد) کو، کہ لے آؤ تم اپنے بیٹے، ہم اپنے لے آتے ہیں؛ تم اپنی عورتیں لے آؤ، ہم اپنی لے آتے ہیں؛ تم اپنے نفس لے آؤ، ہم اپنے لے آتے ہیں''۔ پتہ چلا کہ کل نفسوں میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نفس علی علیہ السلام ہے۔ کل بیٹوں میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیٹے حسن اور حسین علیہما السلام ہیں۔ کل عورتوں میں آپ کی ایک ہی بیٹی فاطمہ علیہا السلام ہے۔ جب حسنین کریمین علیہما السلام بیٹے ہو سکتے ہیں، تو علی علیہ السلام کے نفس ہونے میں کیا قباحت رہ جاتی ہے؟ اب سورۃ کوثر کو پڑھو گے تو فاطمہ علیہا السلام ہی نظر آئے گی۔ حدیثِ منزلت دیکھو گے تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علی علیہ السلام ہی نفسِ رسالت نظر آئے گا۔

پروفیسر امیر علی: آپ کی اس قدر مدلل تقریر کے بعد مجھے یوں احساس ہو رہا ہے کہ آج تک میں آیات بس ملٹن اور شکسپیئر کے اشعار کی طرح ہی تلاوت کرتا رہا ہوں۔ ہاں البتہ میں نے کبھی علامہ طالب جوہری کی کتاب ''خلفاء اثناء عشر'' ضرور پڑھی

تھی؛ لیکن مطلب آج سمجھ آیا۔

البتہ میں چاہتا ہوں کہ آپ عقل، حدیث اور قرآن کے منشور میں ان وارثانِ علم کا مقدمہ اور واضح الفاظ میں عام فہم کیلئے کھول کر بیان کریں۔

سیّد درویش: ہم نے دیکھا کہ قرآن کوئی لاوارث کتاب نہیں۔ اس کی تاویل کے باقاعدہ وارث ہیں جن کے ہاں اللہ اس کو قیامت تک محفوظ کر چکا۔ ان وارثان کی ہی گواہی میں مباہلہ والے دن خود اللہ نے شہادت دی کہ یہ ہیں وہ صدیقین۔

مجھے اب یہ بتائیں کہ آپ کو اگر حدیث لینی ہو، تو اِن صدیقین آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جن کیلئے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مؤدت مانگی ہے، سے لیں گے؛ یا آپ کے نزدیک اُن کی قابلِ قبول ہوں گی جنھوں نے اپنے اپنے انداز میں ان کے ساتھ بُغض و عداوت نبھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی؟

پروفیسر امیر علی: جن کے متعلق امام شافعیؒ کہہ گئے کہ اُن علیہ السلام پر درود بھیجے بغیر نماز نہیں ہوتی، اُن کی حدیث قبول کرنا تو سعادت مندی ہے۔

سیّد درویش: چلو ہمیں حدیث کی روایت میں سند کیلئے اِن میں ربانی محدثین، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والے مل گئے۔ تو اب توحید وہ جو یہ بتائیں گے۔ منصبِ رسالت کی شان سے آگاہی وہ، جو یہ دیں گے۔ پس حدیث خود گواہ بن گئی کہ اُس کا محدث راسخون فی العلم ہے۔ تو کیا یہ ہی درایت کیلئے خود آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ربانی محدثین کا میعار عقل کے لائق نہ قرار پائے گا؟

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب جب احسن الحدیث یعنی قرآن کے وارث مل گئے، ثابت ہوتے ہیں؛ اُن کا قرآن میں ذکر ہے ہونے کا، تو پھر مجھے سمجھ نہیں آتی اس حدیث کا کیا مطلب ہو گا کہ، ''میں اپنے پیچھے قرآن کے ساتھ سنت چھوڑ کر جا رہا ہوں''۔

سیّد درویش: یہ قرآن اور سنت والی بات کس نے بتائی؟

پروفیسر امیر علی: حدیث ہے۔

سیّد درویش: قرآن یا کتاب کیلئے معلم چاہیے جو سمجھائے یا ایک اور کتاب چاہیے؟

پروفیسر امیر علی: بے شک معلم۔

سیّد درویش: اچھا آپ نے کہا کہ یہ قرآن جمع سُنت کی حدیث ہے۔ اچھا حدیث بتائے گا کون؟ سنت سمجھائے گا کون؟ قرآن کیلئے تو معلم ہو گیا۔

پروفیسر امیر علی: جس طرح قرآن کے معلم اُس کے وارثِ علم ہیں۔ تو بے شک حدیث بھی ربانی محدثین ہی بتائیں گے۔

سیّد درویش: کیا قرآن احسن الحدیث نہیں؟

پروفیسر امیر علی: بالکل ہے۔

سیّد درویش: آپ نے ابھی ابھی کہا کہ قرآن کے وارث، احسن الحدیث کے معلم ہیں۔

پروفیسر امیر علی: جی ایسا ہی ہے۔

سیّد درویش: جب ایسا ہی ہے تو حدیثِ ثقلین ثابت نہ ہو گئی: ''میں تمہارے درمیان دو گراں قدر، بھاری چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک ثقلِ اکبر، قرآن؛ دوسری ثقلِ اصغر، میری عترت۔ خبردار! ان سے تمسک مت چھوڑنا، یہاں تک کہ یہ دونوں میرے پاس حوضِ کوثر پر نہ آ جائیں، ورنہ گم راہ ہو جاؤ گے''۔

پروفیسر امیر علی: میری بدنصیبی دیکھئے کہ اس حدیث مبارکہ کے متعلق آج تک سنتا آیا ہوں، لیکن کبھی زحمت نہیں اُٹھائی کہ اس کو سنجیدہ لیتا۔ اور خوش قسمتی ایسی ہے کہ مجھے آپ کی زبانی دل کے کانوں سے سُننے کا موقعہ عطا ہو گیا۔

سیّد درویش: کمال دیکھیۓ کہ آپ نے جو قرآن کے احسن الحدیث ہونے کیلیۓ معلم کے ہونے کو لازم جانا؛ تو میں نے فوراً آپ کی منطقی سوچ کو حدیثِ ثقلین میں پیش کر دیا۔ آپ نے اپنا ہی فکری عکس جب حدیثِ ثقلین کے آئینے میں دیکھا تو آپ کو حق نظر آ گیا۔ میں نے تو صرف آپ کے اندر کی خوبصورتی کو آئینے میں لانے کی خاطر مدد کی ہے۔

یہ حدیث مناظرے، تفسیر، فقہ، تاریخ، ادب، فلسفہ، حکمت، عرفان اور سیاست کے علاوہ بھی عقل وفکر کیلیۓ اسلام میں کلیدی مقام کی مالک ہے۔ اس حدیث کے سچ ہونے میں علامہ حامد حسین کا شہکار ''عبقات الانوار'' اُسی طرح ناقابلِ ابطال ہے، جس طرح علامہ امینی کے کمال ''کتاب الغدیر'' کا کوئی ثانی نہیں۔

اسلام میں تمام جھگڑے، تفرقے اپنی جڑ میں اس ہی حدیث کو جھٹلانے سے برآمد ہوتے ہیں۔ جو کوئی قرآن اور عترت میں جتنی تفریق پیدا کرتا ہے، خود ثقلین سے اُتنا ہی دور ہو کر گمراہی میں بکھرتا چلا جائے گا۔ اِدھر آپ نے عترت کو نکالا، اُدھر قرآن اور حدیث اک دوسرے کے مدِّ مقابل سینہ سپر ہو گئے۔ آپ توجیہات کے قلعے بناتے جائیں، لیکن کوئی حدیثِ ثقلین کے تابناک آفتاب کی منطق اور حقیقت کا عقل و عدل کے کھلے آسمان تلے سامنے نہیں کر سکتا۔

پروفیسر امیر علی: میں آج تک معتزلہ کی علمی تنقیدِ حدیث پر ہی مطمئن بیٹھا تھا۔ بُوعلی جبائی اور قاضی عبدالجبار کے علم الکلام میں محو و مست رہا۔ اور تعلیم اور مطالعہ میں صرف جہالت کو جہلیت کی خوش فہم چرب زبان فنکاری میں ہی تبدیل کرتا آیا۔

سیّد درویش: آپ نے علم الکلام میں امامیہ متکلم ھشام بن الحاکم، امام صادق علیہ السلام کا شاگردِ عزیز، جو اولادِ عقیل ابن ابوطالب علیہ السلام تھا، اُس کے عبیداللہ عمرو معتزلی سے مناظرہ کا مطالعہ کیا ہے؟

پروفیسر امیر علی: یاد نہیں! شاید کیا ہو۔ بس چمگادڑوں کی طرح بغیر بینائی کے اُڑتا پھرتا رہا۔

سیّد درویش: شکر کیجئے ورنہ دنیا ابراہیم علیہ السلام کے چچا آزر، اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابوجہل کی طرح، جو اپنے جیسوں میں ابوالحکمت مشہور تھا، کے یقین اور ایمان قائم نہیں رہے۔ معلوم ہوا کہ ایمان کا مطلب یہ نہیں کہ ابلیس اور فرعون کی طرح باطل پر جہلیت ہمیشہ کیلئے ڈٹ جائے۔ بلکہ جس کیلئے انسان قیام کرے، پہلے دیکھ تو لیے کہ حق ہے بھی کہ نہیں۔

پروفیسر امیر علی: میرے لیے اب یہ نہایت حیران کن امر رہ گیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو شاگردیِ صادق آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے پھر کیا فائدہ ہوا جو علامہ شبلی بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں؟

سیّد درویش: دیکھیں مکتب اہلِ بیت علیہم السلام کا مقدمہ ہے عقل۔ المیہ یہ ہوا کہ ابوحنیفہ کو قیاس کا مغالطہ لاحق ہو گیا۔ حالانکہ صادق آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے امام اعظمؒ کو منع بھی کیا کہ قیاس آرائی چھوڑ دو، کیوں اس کو دین میں داخل کر رہے ہو۔ شبلی نعمانی کی عقیدت اہل بیت علیہم السلام اور تاریخی تحقیق ہمارے لیے محترم ہیں؛ تاہم وہ ظاہری مفاہمت میں اصلی تضاد کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ قیاس میں ظن ہوتا ہے، جبکہ عقل میں یقین کی طرف روشن سفر۔ حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے کہ ''جس چیز کا انجام دیکھنا ہو، اُس کا آغاز دیکھو''۔ قیاس میں مشاہدہ ضروری نہیں لیکن عقل مشاہدے میں ادراک کے حُسن سے آراستہ ہوتی ہے۔ قیاس میں مقصد خام، غیر واضح اور مجرد گمان ہوتا ہے؛ جبکہ عقل قرار ہی نصب العین میں پاتی ہے۔

پروفیسر امیر علی: میں سمجھتا ہوں کہ اہلِ بیت علیہم السلام کا اثر معتزلی عقائد اور تطہیر احادیث میں ابوحنیفہؒ کے فقہ پر نہایت ابہامی ہی رہ جاتا ہے۔

سیّد درویش: استاد ہونے کا مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنے شاگرد کیلئے مرشد بھی ہو۔ بلکہ اکثر و بیشتر شاگرد کا عقیدہ یا اپنا نیا مکتب اُستاد کی ضد بن کر اُس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے شاگرد اپنے عقیدے میں اُستاد کا تابعدار نظر آئے لیکن اُصولی طور پر بالکل منافی ہو۔ خیر یہ بحث بڑی دور نکل جائے گی۔ اتنا جان لینا کافی ہے کہ یہ مکتب آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی تعلیمات کا ہلکا اور خفیف سا رنگ تھا، جس نے ابوحنیفہؒ کو قاعدہ درایت کی صورت میں اصلاح لانے کیلئے آمادہ کر دیا۔ اگر ابوحنیفہ کا یہ قیاسی قاعدہ ہی کم از کم دنیائے اہل سنت میں رواج پا گیا ہوتا تو نظریہ تخطئۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آج وجود تک باقی رہنا تھا۔ عہد جدید میں متعصب مستشرقین اور مغرب زدہ سطحی دماغ مسلمان ان من گھڑت احادیث کا حوالہ ہی تلاش نہ کر پاتے جن کی بنیاد ہی ان کے راویوں کو معصوم قرار دینے پر کھڑی ہے، جو عہدِ رسالت سے سوسو، دو دوسو سال بعد آئے۔ آج ان شانِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منافی، گستاخ اور ملعون لکھاریوں کو خام مواد کیا خلاء سے ملتا ہے؟ نہیں! بلکہ یہ لوگ کتب احادیث سے ضعیف اور عصمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف احادیث اور تفاسیر بالرائے کو ہی رنگ برنگا بنا کر مختلف اشکال میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ پانی میں تو آگ نہیں لگتی۔ یہ لوگ اسی معلوماتی یورینیم کو پروسس کر کے فساد کا ایٹم بم تیار کر لیتے ہیں۔ اگر آغاز میں ہی احادیث کو عقلی طور پر اہل بیت علیہم السلام کے اقوال اور سرپرستی میں پرکھ لیا ہوتا تو کسی کو کبھی جرأت نہیں ہونی تھی کہ انکارِ حدیث کرتا اور قرآن کی تشریح میں اپنی رائے ٹھونستا۔

لیکن جب عترت اور راسخون فی العلوم، قرآن کے وارثوں سے تاویل پوچھنے کی بجائے آیات کی تفسیر بالرائے کرتے پھرو گے، جب صدیقین سے حدیث لینے کی بجائے آپس میں ایک دوسرے کو علم الرجال کی لفظی جادوگریوں سے معصوم راوی اور بے خطاء محدثین بنا کر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس ذات پر اپنی من موج تہمتیں لگاتے اور عام

کرتے پھرو گے، تو پھر اہلِ عقل تفسیر و احادیث کو تنقید کا نشانہ تو بنائیں گے۔ ان کو موقعہ کس نے اور کیوں دیا؟ اصل سوال تو یہ ہے۔ اگر ابھی بھی یقین نہ آتا ہو تو وہی، پروفیسر صاحب آپ والی پیش کردہ حدیث ''تلک الغرانیق العلی'' کے متعلق ذرا خود ہی کوئی غور کر کے جان سکتا ہے کہ یہ کس بے حیائی سے ''ہر رجس سے پاک'' نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے آیتِ تطہیر کو جھٹلا رہی ہے! حالانکہ سورۃ حجر میں بھی صریحاً خدا نے بتا دیا کہ ''یہ یقینی چیز ہے کہ جو میرے بندے ہیں ان پر تجھ کو (شیطان) کسی قسم کا کوئی تصرف نہ ملے گا''۔ لیکن آپ خود جانتے ہیں کہ حافظ ابن حجر جیسے جید عالمِ حدیث کس طرح سینا تانے اس مقصرانہ حدیث کی تائید میں کھڑے پہرہ دے رہے ہیں۔

پروفیسر امیر علی: اُن جیسوں نے، آپ کیا سمجھتے ہیں، ایسا کیوں کیا؟

سیّد درویش: تو اور کیا کریں؟

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

سیّد درویش: جب آپ بنا اُجرت دیئے کسی شے کے دعویدار ہو جاتے ہیں، تو مطلب آپ اُس اُجرت کے دعویدار کے ہی منکر ہو گئے۔ پس اُجرتِ رسالت دینے والے اور ہیں اور اُجرت کے جھٹلانے والے اور ہیں۔ اور یہ اُجرتِ رسالت خود اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی ''مودت فی القربیٰ'' کی صورت میں مانگی۔ مانگی، مطلب کوئی زبردستی حکم نہیں۔ دو نا دو، تمہاری مرضی؛ لیکن دینے والا حسد کر نہیں سکتا، اور نہ دینے والا ظالم اُجرت مانگنے والے کو جھٹلائے اور اہل مودت علیہم السلام سے بُغض کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اُجرت دینے والوں کیلئے مقامِ حدیث و تفسیر اور ہے؛ جبکہ منکرینِ مودت کیلئے مقامِ حدیث اور تفسیر بالکل دوسری ہی ہونا چاہیے۔ ثابت ہوا کہ آیت راسخون فی العلم ہو یا حدیثِ ثقلین؛ جب کسی نے فیصلہ کر لیا کہ اُجرتِ رسالت دینا ہی نہیں تو تعجب کیسا؟ یہ ہی مقصد آخر کار ثابت ہو گا عصمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نصِ قرآنی کے خلاف

شک کرنے سے۔

پروفیسر امیر علی: کئی لکھے اور پڑھے جانے والے حضرات کہتے ہیں کہ آنحضرت کون سا اپنا ذاتی مشن پھیلا رہے تھے کہ اپنے لیے لوگوں سے اُجرت مانگتے پھرتے۔ یہ تو ہدایت من جانب اللہ تھی۔

سیّد درویش: وہی میرے والی بات آ گئی کہ جس نے اُجرتِ رسالت دینی نہیں، اُس کیلئے سو بہانے۔ یہ وہی معاملہ ہے سورۃ البقرہ میں بنی اسرائیل کی گائے والا۔ اچھا مجھے یہ بتائیں کہ اللہ نے کائنات کیوں بنائی؟

پروفیسر امیر علی: اُس کا اس میں مقصد تھا۔

سیّد درویش: کیا مقصد تھا؟

پروفیسر امیر علی: یہ ہی کہ اس کی عبادت کی جائے۔

سیّد درویش: (مسکرا کر بولے:) آپ کیا خیال کرتے ہیں کہ اللہ اپنے مقصد میں عبادت کیلئے اپنی ہی مخلوق کا محتاج تھا؟ جبکہ وہ تو کہتا ہے: ''میں بے نیاز ہوں!''

پروفیسر امیر علی: بالکل نہیں!

(اتنا کہنے کے بعد پروفیسر صاحب پریشان ہو گئے۔ اُنھوں نے ''بالکل نہیں'' اتنا برجستہ بولا کہ وہ فوراً ہی حیران ہو گئے کہ اس کا مطلب کیا تھا جس جواب کا اُن کو خود علم تھا نہ کبھی سوچا۔)

سیّد درویش: میں علم الکلام کی بحث ربوبیت میں یہاں جانا غیر ضروری خیال کرتا تھا۔ البتہ آپ کے ''منفی جواب'' نے سارا معاملہ حل کر دیا۔ اچھا اگر اللہ اپنی مخلوق کا حصولِ مقصد میں محتاج نہیں، اور عبادت مانگتا ہے، کیا یہ تضاد سمجھوں یا ہدایت کے خلاف منشاءِ الٰہی؟ اگر ایسا نہیں، تو پھر کس منطق کے تحت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے پیاروں کیلئے ''مودّت'' مانگنے کا طلب گار، حق دار نہیں ہوسکتا؟ جب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر اللہ

کو گواہی چاہیے کہ جھوٹوں پر لعنت ہو، تو آیتِ مباہلہ ٹھیک؛ اور جب اُن ہی پیاروں کیلئے ''آیتِ مؤدت'' نازل ہو تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانی فطرت سے بھی محروم محبت برحق کا طلبگار نہیں ہو سکتا۔ محبت تو خدا بھی کرتا، کرواتا ہے۔ کیا ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ مانتے ہو؟ کیا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کا حبیب نہیں؟ کیا مؤدت مانگنے سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیغامِ حق کیلئے کوئی رکاوٹ پیدا کر دی یا اُس کے منافی تقاضا کر بیٹھا؟ کیا اپنے پیاروں سے محبت کرنا، اور دوسروں سے ان کیلئے محبت کا طلبگار ہونا جرم ہے، کوئی حق و ہدایت کے خلاف نازیبا امر ہے؟ کیا لفظ ''مؤدت'' سمجھ لیا گیا؟ یہ وہ برحق محبت ہے جس میں گمراہ نہ ہونے کی ضمانت ہو عقل کیلئے۔ جب عقل ہی نہیں تو مؤدت کوئی کیسے کرے گا؟

پروفیسر امیر علی: محبت اور اہلِ محبت کیلئے خیر کا طلبگار ہونا فطرت ہے۔

سیّد درویش: فرض کریں آپ کو کسی نے اعلیٰ پیغامِ سعادت، نعمتِ عظیم دی اور بدلے میں آپ اُس کے عزیزوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ اس متعلق آپ کا کیا کہنا ہے؟

پروفیسر امیر علی: کیسی بھیانک، فطرت دشمن بات ہے؟

سیّد درویش: کیا ایسا ہی کربلا میں ہوا نہیں؟ کیا آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دِن دھاڑے صحرا میں مدینے اور مکے کے محفوظ شہروں سے باہر نکال کر، بھوکا پیاسا، دوستوں اور رشتہ داروں سمیت ذبح نہ کر دیا گیا؟ بازاروں اور درباروں میں غیرت کی شہزادیوں اور معصوم پھول بچوں کو رسوا، ذلیل اور خوف زدہ نہ کیا گیا؟ اگر اجر رسالت کے عادی ہوتے؛ مؤدت فی القربیٰ پر ایمان ہوتا تو سعد کا بیٹا عمر ابن سعد یزیدی سپہ کی سالاری کرتا؟ انس کا بیٹا، سنان بن انس، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مباہلے والے بیٹے حسین علیہ السلام کا سر نیزے پر چڑھا کر فخر سے بازاروں میں، درباروں میں لیے لیے گھومتا؟

اب بتائیں کچھ سمجھ آئی کہ کیا حکمت ہے مؤدت میں جو اللہ نے اجرتِ رسالت میں قرار دی؟ آیتِ مؤدت نے ثابت کر دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ اپنی حکیمانہ دُور بینی

میں قبل از کربلا اور قیامت تک پائے جانے والے ظلم اور عدل، حق اور باطل، صدیقین اور کاذبین کے مابین، جاری جنگ کی ابدی لکیر دیکھ کر مستقل کر چکی۔ اللہ تخلیق کر کے اپنی عبادت کا اجر مانگے تو حقدار۔ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرے تو محبت بھی برحق۔ لیکن جب اللہ کا حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نبوت کا اجر اپنی ذریت، اپنی عترت، اپنی آل کیلئے مؤدت میں مانگے تو غیر معقول مطالبہ نظر آنے لگے! کیوں؟ اس ''کیوں'' کی لائن کا مؤدت والوں اور مؤدت کے منکروں کو الگ الگ کرنا منطقی معجزہ نہیں تو کیا ہے قرآن کی زبانی؟ چھپاتے رہو قیامت تک کربلا کو اُن ضمیر پر بوجھل بے جان توجیہات سے جو اپنی اصل میں حدیثِ ثقلین کے انکار کے طریقے ہیں۔

پروفیسر امیر علی: کچھ اہلِ علم، یا علمائے سُو کہہ لیں، اُن کا یہ ماننا ہے کہ اگر ہم آئمہ اطہار علیہم السلام کے علاوہ کسی دوسری حدیث کو مستند نہیں مانتے تو اسلام میں حدیث پر غور و فکر کی تحریک ختم ہو جائے گی؟ کیا علمی جمود کا یہ اندیشہ قابلِ قبول ہے؟

(سید درویش ہنس پڑے۔)

سیّد درویش: شبلی صاحب کہہ رہے ہیں کہ ''تمام علوم اہل بیت علیہم السلام کے گھر سے نکلے'' یہ حضرات کہتے ہیں کہ اِن کے ہوتے علم کا پہیہ ہی جام ہو جائے گا۔ پاک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتے ہیں: ''میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ''۔ کیوں ''مؤدت فی القربیٰ'' کی تاثیر پتہ چلی؟ مؤدت کی شہد، منکرین کے گلے میں زہر بنتے دیکھا؟

دیکھیں اسلام اور مکتب اہل بیت علیہم السلام کا مقصد آیات اور احادیث کی پوجا پاٹ کروانا نہیں ہے۔ یہ تو اشارے اور اشاروں کا بیان ہیں۔ یہ تو مثالیں ہیں عقل مندوں کیلئے۔ کیوں؟ تاکہ وہ گمراہ ہو کہ ظلم کا شکار بن کے عدل کا دامن نہ چھوڑ دیں۔ عقل کیلئے عدل کے مناروں کو پیغامِ رسالت میں آئمہ علیہم الاسلام نے روشن کیا ہے۔ حق اور باطل کے مابین ہر سمت، ہر وقت، ہر صورت میں جنگ و جدل ہے۔ آئمہ اطہار

علیہم السلام نے حق کے چراغ کو اپنا خون دے کر باطل اور جھوٹ کے ظلم کی آندھی سے محفوظ فرمایا ہے۔ یہ تو علم و معرفت کے خود سنگِ میل ہیں۔ ہر شے میں علم و حکمت اور آیاتِ الٰہیہ ہیں۔ پس اہلِ بیت علیہم السلام کی حدیث کا مقصد اس ہی سوچ کو برآور کرنا ہے۔ کوئی اگر اس کے برعکس سوچتا ہے تو اُس کو اپنی ذہنی دُرستگی کی ضرورت ہے۔ اگر ابھی بھی کسی شقی القلب میں ماننے کی تمنا نہیں، تو اہتمامِ حجت کے طور پر حضرت علی علیہ السلام کا قول پیش کرتے ہوئے میں آگے بڑھ جاؤں گا۔ ''حکمت مؤمن کا گم شدہ خزانہ ہے۔ وہ اُس کو حاصل کرے خواہ کافر کے سینے میں ہی کیوں نہ پوشیدہ ہو''۔

اس کے برعکس حدیث کا مقصد یہ نہیں کہ آپ اپنی ذہنی عیاشی کیلئے منطقی غیر ذمہ داری اور فکری آوارگی میں بہترین توانیاں علم الرجال میں ہی ضائع کر دیں۔ کیا اِس کو عقلی آزادی کہتے ہیں؟ تطہیر حدیث آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد ہی ہے کہ غور و فکر کو خواہ مخواہ زیاں سے بچایا جائے۔

اگر اب بھی کوئی بد دماغ بضد، غلط حدیث اور غیر معقول تفسیر کو کوئی قیمتی پتھر سمجھتا ہے، کہ جس پر عقل رگڑ رگڑ کر اپنے فہم اور روحانیت کے آلے کو تیز کرتی رہے؛ تو اُس کا علاج کھلی چھٹی ہے۔ کیا عصمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطلقہ ہونے کو جھٹلانے سے عقل میں کمال اور خود مختاری پیدا ہو جاتی ہے؟ کیا حدیث وہ ٹھیک ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطا کار ثابت ہو، کہ کہیں پاک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مافوق الفطرت نہ ہو جائے؟ حدیث معصوم علیہ السلام کا یہ ہی مقدمہ ہے کہ عقل کو خواہ مخواہ اپنی توانیاں کے زیاں سے بچایا جائے۔

یہ احادیثِ معصومین علیہم السلام کی ہی وجہ ہے کہ آج ہمیں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں بھی عصمت ہی حق کیلئے ناگزیر ملتی ہے۔ جب اللہ نے سورۃ حشر میں حکم جو دے دیا کہ: ''رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو حکم بھی تم کو دے اُس کی اتباع کرو، اور جس بات سے منع کرے اُس سے باز رہو''۔ ''وما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا'' پس

اللہ نے لفظ اتباع استعمال کیا ہے۔ اطاعت نہیں! اطاعت اور ہے، اتباع اور ہے۔ جب پیروی فطرت ہوتو اتباع ہے۔

پروفیسر امیرعلی: میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بنیادی فرق کو اُجاگر کریں۔

سیّد درویش: اتباع، اطاعت کی طرح حکمیہ نہیں۔ اتباع کا مادہ ہے ''تبع''۔ اس سے مشتق ہے: ''تبیع''۔ مطلب گائے کا بچہ وہ جو اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلتا ہو۔ وہ کسی حکم یا فرمان کے تحت نہیں چلتا۔ اُس کا یہ عمل فطری محبت اور کشش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر انبیاء علیہم السلام سے صدورِ خطاء جائز ہوتا تو اتباع کو فطرت میں نہ رکھا جاتا۔ ایسا نہیں کہ حکم آیا تو اطاعت کرو، حکم نہیں تو پیروی غیر لازم ہوگئی۔ حکمیہ اطاعت کا مطلب ہے، غیر مشروط اتباع کا کسی معاملے میں مخصوص ہونا۔

سورۃ آلِ عمران میں اللہ فرماتا ہے: ''کہہ دو کہ اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری راہ پر چلو۔ اللہ بھی تم سے محبت رکھے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا''۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خطائیں، کوتاہیاں اور بشری نقائص ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں بلکہ گائے کے بچے کی طرح اُمتی بن کر پیچھے پیچھے مؤدت فی القربیٰ کے جذبۂ فطرت میں چلو۔ گدھے کے سرکش بچے کی طرح، اپنی مرضی سے اِدھر اُدھر اور آگے آگے راست پیرمت دوڑتے پُھدکتے پھرو۔ اس لیے یہ احادیثِ آئمہ تمہاری عقل کو اتباع کا سلیقہ بتاتی ہیں تاکہ تمہاری دماغی توانیاں ضائع نہ ہوں اور تم گدھے کے بچے کی طرح خواہ مخواہ آوارہ فکری میں پُھدکتے پُھوکتے راہ گم نہ کر بیٹھو۔

پروفیسر امیر علی: میں نے قرآن کے الفاظ میں حدیث کی حقیقت سے اتنا گہرا تعلق کبھی نہیں سمجھا۔

سیّد درویش: قرآن آبِ حیات کی مانند ہے۔ آب میں ایک جوہری حرکت پائی جاتی ہے، جو حیات کہلاتی ہے۔ آب کے جوہر میں پائی جانے والی یہ حرکت کبھی دودھ تو

کبھی بادل، کبھی پھلوں کا رس تو کبھی پھولوں کا، کبھی آنسو، تو کبھی پسینے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ آبِ حیات کوئی جامد شے نہیں، بلکہ اپنے جوہر میں متحرک حقیقت ہے۔ یہ حرکت کے جوہر کا اصل سے نکل کر مختلف صورتوں میں، حالات اور تقاضوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے متشکل ہو جانا، ایک وسیلے پر دال ہوتا ہے: جو کبھی گائے تو کبھی سورج، کبھی شجر تو کبھی نحل، کبھی جذباتی، تو کبھی مشفقتی جاندار کے ہونے کو ثابت کرتا ہے۔

یہ آبِ حیات، قرآن اگر احسن الحدیث ہے تو دودھ، بادل، رس، شہد، آنسو اور پسینہ، احادیث۔ احسن الحدیث کی جوہری حرکت کو جو احادیث میں منقلب کرے گا وہ راسخون فی العلم کا وسیلہ معصوم محدثین آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاک گھرانہ ہے۔

اس کلامِ حدیث و احسن الحدیث کے بعد اگر کوئی مجھ پر اخباری ہونے کا شبہ یا الزام لگائے، تو مطلب اُس صاحبِ عقل کے پلے میری اصل بات پڑی ہی نہیں۔ وہ مکتب اہل بیت علیہم السلام کے عقلی مقدمۂ حدیث کو سمجھنے سے قاصر، تقصریت کا ہی اُلٹا عکس ہے۔

(کافی دیر خاموشی کے بعد مولوی حامد رضا بولے:)

مولوی حامد رضا: انسان تو سیّد صاحب خطاء کا پُتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود بتاتے ہیں کہ ''ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشر بنا کر بھیجا ہے''۔ کیا آپ اس آیت مبارکہ کو کاٹ سکتے ہیں؟

سیّد درویش: (زوردار قہقہہ لگا کر بولے:) لو مجھے بھلا کاٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ آیت تو خود اُن کو کاٹ رہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشر سمجھے بیٹھے بغلیں بجا رہے ہیں۔

مولوی حامد رضا: میں سمجھا نہیں سیّد صاحب آپ نے کیا کہا۔ (مولوی صاحب کچھ گھبرا گئے تھے)

سیّد درویش: سمجھنے کی بھی خاص ضرورت نہیں۔ صرف آیت کے ظاہری الفاظ اور

ترتیب پر ذرا تحمل سے اگر آپ نے غور فرمایا ہوتا تو آج آپ اس کو میرے سامنے لانے کی بجائے، اس کو خصوصاً مجھ سے چھپا رہے ہوتے۔ اب سنئے گا ذرا آیت کے بونے کا انداز: ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو'' ہم نے بشر ''بنا کر'' بھیجا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو! بشر کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنا کر نہیں بھیجا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشر بنا کر بھیجا۔ تو آیتِ بشری آمد سے قبل از تخلیق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہونے پر دال ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میثاق الانبیاء والی آیت ساقط ہو جانا تھی۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ بشری چمڑے میں ملبوس ہونے سے حقیقتِ نبوی بشری ثابت ہو جاتی ہے؟ اب مجھے کچھ پوچھنے کی اجازت ہے؟

مولوی حامد رضا: جی ضرور پوچھیں! صحیح سوال میں بھی آدھ علم تو ہوتا ہے۔

سیّد درویش: کیا ملائکہ اور بشر ایک ہی ہوتے ہیں؟

مولوی حامد رضا: بالکل نہیں!

سیّد درویش: کیوں؟

مولوی حامد رضا: بالکل جُداگانہ فطرتیں ہیں۔ انسان مٹی کا پُتلا ہے جبکہ ملائکہ اپنی فطرت میں نوری مخلوق ہیں۔ فرشتے بھلا کیوں بشر ہونے لگے؟

سیّد درویش: (ہنستے ہیں) مولوی صاحب آپ کیوں غصے میں آ گئے ہیں؟ اس میں جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے پتہ ہے، آپ ایک فرشتہ صفت انسان ہیں۔ (یہ سننا تھا کہ پروفیسر صاحب کے ساتھ خود مولوی صاحب کی بھی ہنسی نکل گئی۔ اب سیّد صاحب دوبارہ بولے:)

مجھے یہ بتائیں کہ قومِ لوط علیہ السلام نے فرشتوں کو بشری صورت میں دیکھا کہ نہیں دیکھا؟

مولوی حامد رضا: (کچھ پریشان ہو کر بولے:) جی دیکھا۔

سیّد درویش: جبرئیل کیا مادرِ عیسیٰ علیہ السلام اور زوجۂ ابراہیم علیہ السلام کے

سامنے بشریت میں نمودار ہو کر ہمکلام ہوئے تھے یا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟

مولوی حامد رضا: آپ ٹھیک فرما رہے ہیں۔

سیّد درویش: مطلب میں جھوٹ بول رہا ہوں؟

مولوی حامد رضا: نہیں سیّد صاحب میرا یہ کہنا تھا کہ حضرت جبرئیل بشری صورت میں نہ صرف متشکل تھے، بلکہ گویا بھی ہوئے۔

سیّد درویش: مولوی صاحب آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب میں آپ کو سچ بتاؤں، تو میں حیران ہوں۔ میں نے اتنی واضح قرآنی حقیقت، جو اتنی آسان فہم ہے، کو کبھی سمجھا ہی نہیں۔ خیر آپ گفتگو کا سلسلہ جاری رکھیں تا کہ میں سیر حاصل فائدہ اُٹھا سکوں۔

سیّد درویش: ان دونوں میں سے کوئی ایک بی بی علیہا السلام نبی ہو؟

مولوی حامد رضا: کوئی عورت نبی نہیں ہوئی۔

سیّد درویش: اب تین حقائق کھل کر سامنے آ گئے۔

(i) جبرائیل کی ملاقات ہو جانے سے کوئی نبی علیہ السلام نہیں ہو جاتا۔

(ii) ملائکہ کی نورانی فطرت بشری صورت میں ظاہر ہو کر اپنی حقیقی نورانیت کھو نہیں دیتی۔

(iii) ایک ہی شخص اِدھر بشری، اندر غیر بشری۔

معلوم ہوا کہ نظر کو اگر باطن جاننا ہے تو ظاہر کا حجاب اُتار کر پار باطنیت میں دیکھنا ہو گا۔ اب کوئی مجھے بتائے کہ فرشتے بشری لباس میں بھی فرشتے رہیں۔ تو جس ''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو'' بشر ''بنا کر'' بھیجا: اُس کیلئے اپنی نبوتی فطرت بشری صورت میں کھونا کیوں لازم وملزوم قرار پائے گا؟

یہ بشریت اور نبوت کی ثنویت کا فساد اصل میں فلسفۂ نوع کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

جب تک نوع کو جنس پر قیاس کیا جائے گا، یہ ہی جاہلانہ ثنویت، عیسائی تثلیت کی طرح سر اُٹھاتی رہے گی۔ اسی لیے اتباع کا مطلب ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر حالت میں معصوم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔بس جان لیجئے کہ قیاس ظلم کی منطقی صورت ہوتی ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ جبرائیل کا مطلب ہے کہ وہ آنحضرت کی پیدائش کے 40سال بعد آئے اور بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔لیکن اُس وقت تو جبرائیل نظر نہیں آئے، کہاں تھے جب تخلیق سے پہلے عالمِ ارواح میں، یوم المیثاق سے بھی قبل، جب انبیاء تھے۔

پس مولوی صاحب آپ کی مایہ ناز آیت میں اللہ نے بالکل اُسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشر بنا کر بھیجا جس طرح ملائکہ اور جبرائیل کو متشکل کر کے قوم لوط علیہ السلام، حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت سارہ علیہا السلام کی طرف بھیجا۔

مولوی حامد رضا: کچھ اہلِ فکر کا ماننا ہے کہ انسان دو ہی صورتوں میں معصوم ہو سکتا ہے۔ یا وہ خدا ہو گا ورنہ حیوانِ مطلق۔

سیّد درویش: فکر اور اِن کو: کتنی فکر ہے ان کو! جب احمقوں کی سمجھ کا پیمانہ لبریز ہو جائے، تو ایسے فکر مند ایسے ہی شوشے چھوڑ کر اپنے آپ کو قیاسی تسلیاں دیتے ہیں۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب کیسے؟

سیّد درویش: یہ ارسطوی سوچ رکھنے والوں کی باتیں ہیں، جو گدھے کے بچے کی طرح اِدھر اُدھر اور آگے آگے دوڑنے کے عادی ہوتے ہیں۔ان کو حق کا اتباع چونکہ کرنا نہیں آتا، اِن کا سانس گھٹنے لگتا ہے، اس لیے چلتے نہیں، پُھدکتے ہیں۔ چنانچہ ایسی گفتگو To Be God or Beast تنقید نہیں بلکہ نقطہ چینی، قیاس کا نتیجہ ہے؛ علم وعقل کے خلاف زہر ہے۔ ادراک کا فقدان ہے؛ اصل تنقید کا گلہ دبانا ہے۔کوئی اِن سے پوچھے بھلا ملائکہ جو مسلّمہ طور پر معصوم عن الخطاء ہوتے ہیں، کیا وہ اپنی عصمت کی وجہ سے غلو کر

کے خدا بن جاتے ہیں یا پھر گر کر حیوانیات میں شامل ہو جایا کرتے ہیں؟ کیا ان لوگوں کا اللہ، رحمن، رحیم اور عالمین کا خالق اپنی صفات میں اتنا کمزور، قبیح، حاسد اور غیر مطمئن ہے کہ اپنے ہی انبیاء علیہم السلام، اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے پر اُتر آئے؟ ان کا اللہ تو کوئی یونانی دیومالائی کے خدا فلک، زیوس جیسا لگتا ہے۔ کیا صفات وعصمت میں اللہ کی عظمت کے مقرر کردہ نمائندے اُس کے ہی حریف بن جاتے ہیں؟ یہ مقصرانہ گمان بازیاں اللہ کو اُس کے حسد میں محدود کرنے کے مترادف ہے۔ بسا اوقات میں حیران ہوتا ہوں کہ مشرکین جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی ہونے کے منکر تھے، آپ کو صادق و امین جانتے۔ امانتیں تک رکھواتے تھے۔ لیکن شاباش ہے اُن مسلمانوں پر جن کی علمیت کا گزارہ ہی اس قیاس پر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ بشریت میں ملبوس تھا، اس لیے اس جرم کی سزا میں اس کی معصومیت ثابت کرنا نرا غلو ہے۔ اس پر کمال یہ کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُمتی راوی اور حدیثیں اکٹھی کرنے والے تھے، اُن کو غیر معصوم کہنا جرم بن گیا۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب آپ نے نظریہ تخطئۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ابطال شاندار کیا ہے۔ تاہم سورۃ فتح میں تین آیات ایسی کلیدی ہیں، اس نظریے کی تشکیل میں کہ جن پر تبصرہ وتنقید کیے بغیر ہم کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ آیات بمع ترجمہ یہ ہیں:

انا فتحنا لك فتحا مبينا O ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر ويتم نعمته عليك ويهديك صراطا مستقيما O وينصرك الله نصرا عزيزا O

(ترجمہ:) ''ہم نے فیصلہ کر دیا تیرے لیے کہ معاف کرے تجھ کو اللہ، جو آگے ہو چکے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے۔ اور پورا کر دے تجھ پر اپنا احسان اور چلائے تجھ کو سیدھی راہ پر اور مدد کرے اللہ تیری زبردست''۔

سب سے پہلی آیت میں اللہ کہتا ہے: ''ہم نے تجھے فتح المبین عطا کی''۔

سیّد درویش: آپ نے بجا فرمایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عصمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے برعکس نظریہ تخطئۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ثنویت پر بنائی گئی بنیاد کو پاش پاش کرنے میں آیت فتح المبین قطعاً کلیدی ہے۔ چھ ہجری کو مقامِ حدیبیہ پر مدینہ آتے ہوئے آپ کو فتح المبین کی خوشخبری وحی ہوئی۔ آپ مجھے بتائیں گے کہ ان آیات پیش کردہ میں تمام مسئلے، غلط فہمی کا موجب اور بدبختی کا مرکز کہاں پایا جاتا ہے؟

مولوی حامد رضا: میں اس بارے میں نہیں جانتا۔

سیّد درویش: سارا فساد لفظ ''ذنب'' کے مغالطے نے پیدا کیا ہے۔

مولوی حامد رضا: صرف ایک لفظ میں اتنی طاقت ہوسکتی ہے کہ پوری آیات کے معنی بدل کر رکھ دے، جس پر صدیوں کیلئے نظریہ کیا عقیدہ استوار ہو جائے؟

سیّد درویش: لفظ کو چھوڑیں۔ لفظ تو بہت بڑا ہوتا ہے، فقط ایک نقطہ بھی ہر چیز کو اُلٹا کے رکھ دیتا ہے۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب وہ کیسے؟

سیّد درویش: رحمت کی ''ر'' پر نقطہ ڈال کر خود ہی دیکھ لیں، زحمت ہر چیز کو اُلٹا دے گی۔ میں ''ب'' سے نقطہ تحت الباء ختم کر دیتا ہوں، تو الف سے کسی شے کی مجال نہیں جو باہر نکل سکے، پ، ت، ث ہی ناپید ہو جائیں گے۔ ل، م تو بہت دور خواب میں بھی نہیں آئیں گے۔ نقطہ آغاز ہے، نقطہ اوّل ہے۔ ہر چیز کا انجام ہے: آخر میں بس نقطہ ہے۔ نقطہ بیج ہے اور ساری تخلیق اس کا شجر۔ فیثا غورث کے اعداد تو خود پیداوار ہیں، اس نقطے کی! اب بھی یقین نہیں آتا تو بے شک The Paradoxes of Zeno کا ازخود مطالعہ کر لو۔ کیا عجائبات کا مظہر ہے یہ شخص نقطہ!

مولوی صاحب لفظ ''ذنب'' کے مروّجہ معنی کیا ہیں، آپ اپنی زبانی بیان فرمایئے

گا۔

مولوی حامد رضا: ''گناہ'' یا ''خطا''۔

سیّد درویش: بس ساری غلطی لفظ ''ذنب'' کو ''خطا، یا گناہ'' کے معنوں میں پاک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قیاس کرنا ہے۔ چناچہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشری تقصیری کا بنیادی سبب فلسفۂ نوعیت کی نافہمی ہی رہا ہے۔ کیونکہ ہم جنس کو ہی نوع کی پہچان، حقیقتِ نوع قرار دیتے ہیں۔ باالفاظِ دیگر ہم اصلیت کو ظاہریت میں مظلوم بنا چھوڑتے ہیں۔ اسی لیے میں پھر کہوں گا کہ یہ ذہنی ظلم قیاس ہے۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب لیکن اس لفظی قیاس آرائی میں فلسفہ نوع کی نافہمی کیسے ثابت ہو رہی ہے؟

سیّد درویش: یہ فلسفہ نوع الفاظ اور معانی کے نسبت و تناسب میں جاری و ساری ہے۔ الفاظ کے معنی منسوب الیہ اور مضاف الیہ کی نسبت بدل جاتے ہیں۔ اگر یہ تبدیل نہیں ہو پاتے تو مطلب یہ ہوا کہ آپ جو جانتے ہیں وہ قیاس کے ہاتھوں اپنی حقیقت میں تباہ ہو جائے گا۔

مولوی حامد رضا: الفاظ کے معنی کا منسوب الیہ اور مضاف الیہ کی نسبت عصمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سمجھنے کیلئے یوں بدل جانا، کتنا سحر آفریں قاعدہ معلوم ہوتا ہے!

سیّد درویش: اس قاعدے کی کلید عظیم فلسفی صدرالدین شیرازی کی ''جوہری حرکت'' کے فلسفے کو لفظ کی رُوح میں تلاش کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔

مولوی حامد رضا: لیکن وہ تو فلسفہ تخلیقِ کائنات سے عبارت ہے۔

سیّد درویش: جی ایسا ہی ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ہم اُس تخلیقی فلسفے کی ہی مدد سے الفاظ میں جوہری حرکت کیلئے تخلیقی معنی جان سکتے ہیں۔ یہ جوہری حرکت ایک صورت سے دوسری میں منقلب ہوتی ہے۔ اس کی میں آبِ حیات میں مثال دے چکا

ہوں۔

دیکھیں الفاظ بھی مانند جسم ہیں۔جسم کی طرح وہ بھی اپنے اندر بیان کرنے والے کے مقصد کو ظاہریت میں ملبوس کرتے ہیں۔ لفظ میں چونکہ روحانی حرکت کا جوہر ہوتا ہے، اس لیے لفظ کو جامد جاننا لاشعوری ہے۔لفظ اپنی حقیقت میں نسبت بدلنے سے، نوع کے مطابق اپنے اندر پوشیدہ امکانی توانائی کی حرکی منتقلی میں عقل وفکر کیلئے معنی کو نئی اور مختلف جہتوں میں کھول کر سامنے لے آتا ہے۔ لفظ کے معنی کی یہ نئی سطح کوئی خارجی تبدیلی نہیں، بلکہ داخلی حقیقت کا نئی ظاہریت میں نمودار ہونا ہے۔ یوں لفظ ''ذنب'' میں عصمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقت امکانی طور پر غیرمرئی پائی جاتی ہے۔لیکن کلام میں حرکت کے دوران یہ حقیقت ظاہر میں آجاتی ہے؛ بیج سے پورا درخت اور ثمر برآمد ہوتے ہیں۔

مولوی حامد رضا: آپ کا یہ ''نظریہ جوہری حرکت'' الفاظ میں پوشیدہ معنی کو نسبت کے لحاظ سے کلام میں جاننے واسطے نہایت پُرمغز ہے۔آپ اس نظریے کی کلید سے لفظ ''ذنب'' کیسے کھول کر اس میں محفوظ عصمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برآمد کریں گے؟

سیّد درویش: آیت فتح المبین ''انا فتحنا لک فتحًا مبینًا'' میں فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے جو آئندہ تمام فتوحاتِ اسلامی کیلئے بمنزلہ اساس ثابت ہوئی۔ بیضاوی اپنی تفسیر میں لکھتا ہے کہ یہ عربی زبان کا مسلّمہ قاعدہ ہے کہ جب کسی آئندہ واقعہ کی یقین کے ساتھ خبر دی جاتی ہے تو اُس کیلئے ماضی کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بخاری میں عبداللہ بن مغفل سے منقول حدیث ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے روز آیت ''انا فتحًا لک'' بڑی خوش الحانی سے تلاوت فرمائی۔

میں سمجھتا ہوں ایک مرتبہ آیت فتح المبین میں عصمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شعور پیدا ہو گیا تو تمام انبیاء علیہم السلام کی معصومیت ثابت ہو جانے میں کوئی دقّت باقی نہیں رہے

گی۔بس لفظ ''ذنب'' کے جوہری انتقال میں نوع کو ثابت دیکھنا ہے۔

مولوی حامد رضا: لیکن سیّد صاحب یہ لفظ کون سا سورۃ فتح کی ان آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کیلیئے ہی خصوصاً استعمال ہوا ہے؟ جب عزیزِ مصر حضرت یوسف علیہ السلام کی بے گناہی سے مطمئن ہو گیا تو یوں اپنی زوجہ زلیخا سے مخاطب ہوا: ''**استغفری لذنبک انک کنت من الخطین**'' یعنی ''اے زلیخا! یقیناً تُو خطا کار اور گناہ کار ہے، پس تُو (خدا سے) مغفرت طلب کر''۔

سیّد درویش: بالکل ٹھیک؛ اور میرا جوہری حرکت کے نظریے میں کیا مقدمہ تھا؟

مولوی حامد رضا: یہی کہ لفظ کے معنی اپنی حرکتِ کلام میں نسبت کے لحاظ سے خود کو بدل لیتے ہیں۔

سیّد درویش: کیا زلیخا معصوم تھی؟

مولوی حامد رضا: نہیں۔

سیّد درویش: تو آپ نے جو مثال دی ہے اُس کا نبی علیہ السلام سے تو کوئی تعلق نہیں۔ ذنب کا لفظ یہاں غیر معصوم کی نسبت سے گناہ یا خطاء کا ہی معنی دے گا۔ میں نے کب کہا کہ زلیخا معصوم تھی؟

مولوی حامد رضا: تو نبی علیہ السلام سے اس کی نسبت ہونا کیسے معنی کو بدل دے گا؟

سیّد درویش: سورۃ شعراء، دوسرا رکوع، آیت: 15-11 تک۔ ترجمہ میں کرنے لگا ہوں، کوئی کمی بیشی نہ رہ جائے، عربی عبارت آپ دیکھ لیجیئے گا۔ ذرا غور سے سنئے! ''اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ ؑ کو جا کر اُس قوم گناہ گار کے پاس، قوم فرعون کے پاس۔ کیا وہ ڈرتے نہیں۔ بولا اے رب میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلائیں اور رُکتا ہے میرا جی اور نہیں چلتی میری زبان۔ سو پیغام دے ہارون کو۔ اور اِن کو مجھ پر ہے ایک گناہ

کا دعویٰ۔سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں''۔

یہاں ''ولھم علی ذنب'' سے اُس ظالم فرعونی کی مرگ ناگہانی کی طرف اشارہ ہے۔موسیٰ علیہ السلام کا ارادہ قتل تو تھا ہی نہیں۔کیا مؤمن کو بچانا عمداً گناہ ہوتا ہے یا پھر خطاء؟ اگر نہیں تو پھر موسیٰ علیہ السلام کی عصمت پر الزام کیسا؟

مولوی حامد رضا: بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو اُلٹی اپنی ہی جان خطرے میں ڈال دی۔

سیّد درویش: لیکن زمخشری صاحب کا اپنی تفسیر کشاف میں اور مفسر بیضاوی صاحب کا کہنا ہے کہ ''ذنب'' کے معنی ہیں ایسی تدبیری کوتاہیاں جن پر عتابِ الٰہی ہو سکتا تھا۔ یہ ''ہوسکتا تھا'' کہہ کر یہ صاحب نبی علیہ السلام پر تنقیدی احسان اپنا جتلا رہے ہیں۔

مولوی حامد رضا: پھر سورۂ قصص میں سیّد صاحب یہ کیوں کہا جنابِ موسیٰ علیہ السلام نے: ''**ھٰذا من عمل الشیطٰن انه عدو مضل مبین O قال رب انی ظلمت نفسی فاغفر فغفر له انه ھو الغفور الرحیم**'' یعنی ''یہ شیطان کا عمل تھا، وہ کھلا ہوا دشمن اور گمراہ کن ہے، (موسیٰ علیہ السلام نے کہا) پروردگار میں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔تُو مجھے بخش دے۔خدا نے اسے بخش دیا۔ بے شک وہ بہت بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے''۔

سیّد درویش: آپ ثابت کیا کرنا چاہتے ہیں؟

مولوی حامد رضا: کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی خطاء کا اعتراف کرتے ہوئے مغفرت کیلئے دعا گو نہیں؟

سیّد درویش: کیسی مغفرت؟ کون سا جرم؟ کیسا اعتراف؟

مولوی حامد رضا: موسیٰ علیہ السلام خود فرما رہے ہیں کہ اُنہوں نے اپنے نفس پر ظلم

ڈھایا۔

سیّد درویش: کیسا ظلم؟

مولوی حامد رضا: ظلم تو ظلم ہی ہوتا ہے۔

سیّد درویش: کیوں لفظ ظلم پر آپ خود ظلم کر رہے ہیں؟

مولوی حامد رضا: لفظ واضح ہے۔

سیّد درویش: اچھا اللہ کیا ''مکار'' ہے؟

مولوی حامد رضا: بالکل نہیں! وہ حق اور سچ ہے۔

سیّد درویش: اچھا اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں ایک ''المکار'' بھی ہے، اس کے بارے میں شاید آپ بھول گئے۔

مولوی حامد رضا: اللہ تعالیٰ کیلئے لفظ ''المکار'' کے معنی وہ نہیں جو ہم لوگوں کیلئے جائز ہیں۔ اللہ کے اس لفظ، نام میں ایک حکمت، مصلحت، اعلیٰ تدبیر ہے۔

سیّد درویش: یہ ہی تو میں آپ کو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ لفظ کے معنی نسبت سے بدل جاتے ہیں۔ اچھا آیۂ صلوٰۃ میں اللہ اور مؤمنین کیلئے ایک ہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ ''صلّی علی'' مؤمنین کی نسبت تو جی سمجھ آتی ہے کہ ''طلبِ رحمت ہونا'': کیا اللہ بھی اسی طرح طالبِ رحمت ہوتا ہے؟

مولوی حامد رضا: بالکل نہیں! رب العالمین بھلا کیوں کسی مخلوق کا رحمت کیلئے محتاج ہوگا؟ وہ تو رحمتیں نازل کرنے والا رحیم و کریم ہے۔

سیّد درویش: دیکھا ایک ہی لفظ کے معنی مختلف کیا، متضاد بھی ہو جاتے ہیں۔

مولوی حامد رضا: اس طرح لفظ ''ذنب'' پھر کیا منطقی معنی دے گا؟

سیّد درویش: دیکھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مظلوم اسرائیلی کی مدد کر کے عدل و احسان کا عمل سرانجام دیا کیونکہ فرعونی اُس کی بیوی سے جبراً زنا کرنے پر تُلا ہوا

تھا۔ یہ شیطانی عمل ''ھٰذا من'' موسوی مُکّے سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ ''ھٰذا'' سے مراد تو وہ جھگڑا تھا جو فرعونی نے برپا کر رکھا تھا، جس کی مدافعت کی اسرائیلی نے اپنے اندر سکت نہ پا کر جناب موسیٰ علیہ السلام سے استغاثہ کیا۔ تو جب موسیٰ علیہ السلام نے کوئی ارتکابِ جرم کیا ہی نہیں تو ''رب انی ظلمت نفسی فاغفرلی'' کے فقرے ''میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، پس تُو مجھے بخش دے'' کا موسیٰ علیہ السلام سے قطعاً کوئی ظلم کے لحاظ سے تعلق نہیں بنتا۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب دیکھیں یہاں موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کوئی دوسرا غیر معصوم زلیخا کی طرح تو موجود ہی نہ ہے۔ تو لفظ ''غفر'' میں آپ علیہ السلام کیوں معافی مانگ رہے ہیں۔ میرے لیے یہ نہایت ہی پریشان کن امر ہے، کیونکہ آپ نے بجا فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو عدل و احسان کا فریضہ سرانجام دیا۔

سیّد درویش: مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ ہم ''ظلم'' اور ''غفر'' کے مروّجہ معنی جو ''زیادتی'' اور ''بخشنے'' کے ہیں، اُن سے دھوکہ کھا کر زبردستی معصوم موسیٰ علیہ السلام سے منسوب کرنے پر بضد ہیں۔ اچھا فرض کریں آپ کے پاس اعداد ہیں: 5,3,2۔ میں کہتا ہوں: اِن کا حساب کریں۔ آپ پوچھیں گے، آیا جمع کرنا ہے؛ ضرب دینی ہے؛ یا تقسیم کرنا ہے۔ مطلب اعداد وہی، لیکن جمع، ضرب اور تقسیم کی علامات بتاتی ہیں کہ نسبت بدلنے سے تناسب اپنے نتائج میں کچھ کا کچھ ہو جائے گا۔

مولوی حامد رضا: کیوں نہیں!

سیّد درویش: ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ ہم اعداد میں جوہری حرکت کے نسب و تناسب کو برباد کر دیں گے۔ بس الفاظ بھی اعداد ہوتے ہیں، صرف اندازِ بیان اپنی ظاہری صورت میں دوسرا نظر آتا ہے۔ آپ فزکس کے سیل کو بائیالوجی کے سیل پر قیاس کر کے کیوں لفظ ''سیل'' پر ظلم کرتے ہیں؟

مولوی حامد رضا: (مسکرا کر) اسی لیے آپ کہہ رہے تھے کہ میں لفظ ظلم پر کیوں ظلم کر رہا تھا۔

سیّد درویش: لگتا ابھی بھی آپ کو شک ہے۔ (مسکراتے ہوئے)

مولوی حامد رضا: ''غفر'' کا ''ظلم'' سے لیکن کیا تعلق؟ ظلم کے لغوی معنی تو ہوئے کسی چیز کو بے موقع رکھنا۔

سیّد درویش: اسی ہی طرح ''غفر'' کا لغوی مطلب ہوتا ہے، ڈھانپنا، پوشیدہ کرنا، محفوظ کرنا۔ یوں عربی زبان میں بوقتِ جنگ سر کو محفوظ رکھنے کیلئے جو ''خُود'' استعمال کیا جاتا ہے اُسے ''مغفر'' کہتے ہیں۔

اب ذرا اس سے پہلی آیت کے ابتدائی فقرات کو پیش نظر رکھیں: ''ودخل المدینه علی حسین غفلة من اهلها''۔ یعنی ''ایک دن موسیٰ فرعون کے شہر میں ایسے وقت داخل ہوئے جبکہ وہاں کے لوگ (نیند کی) غفلت میں پڑے ہوئے تھے''۔ یہ وہی دن تھا کہ جب فرعونی کی موت ہو چکی تھی۔

مولوی حامد رضا: ظالم اور غفر کے ان لغوی معنوں کے بعد آیت کا مطلب کیا ثابت ہوگا؟

سیّد درویش: ''اے پالنے والے میں نے شہرِ فرعون میں داخل ہو کر اپنی جان کو 'بے جا، پہونچا دیا۔ اب تو ہی دشمنوں سے میری 'حفاظت، فرما۔ اللہ نے آپ علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھا''۔

مولوی حامد رضا: واہ! کس قدر سچی اُتری ہے آپ کی یہ تفسیر عصمتِ موسیٰ علیہ السلام پر۔

سیّد درویش: میرا کسی تفسیر بالرائے سے لینا دینا نہیں۔ اپنے مقصد کیلئے حوالہ دینا اور بات ہے۔ میں نے تو فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام علی رضا علیہ السلام کے اُس جواب کو

پھیلا کر بیان کر دیا جو آپ علیہ السلام نے مامون رشید کے استفسار پر دیا۔

(احتجاج۔شیخ طبرسی)

اِن کم عقل نفوس کے بارے میں، جو مقامِ عصمت الانبیاء علیہم السلام کو اپنے قیاس وگمان کے زور سے اپنی غیر معصوم سطح پر گرا لانے پہ بڑے نازاں ہوتے ہیں، مجھے مشہور انگریز شاعر Alexandar Pope کا جملہ بڑا صادر معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''فرشتے جہاں قدم رکھتے ڈرتے ہیں؛ بیوقوف وہاں سے بھاگتے گزر جاتے ہیں''۔

میرا خیال ہے کہ مولوی صاحب آپ میں اب حوصلہ پیدا ہو گیا ہے کہ لفظ ''ذنب'' کا استعمال معصوم نبی علیہ السلام کی نسبت لغوی معنی میں برداشت کر سکیں۔

مولوی حامد رضا: جی ہاں ہم زلیخا کے ضمن میں تو اس کو ''خطائے عمد'' جان چکے ہیں۔

سیّد درویش: (ہنس کر پوچھتے ہیں:) کیا آپ کو جناب موسیٰ علیہ السلام ابھی بھی زلیخا جیسے معلوم ہوتے ہیں؟

مولوی حامد رضا: (مسکراتے ہیں) اب نہیں۔

سیّد درویش: ہم نے دیکھ لیا کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے گذشتہ آیت میں صافطور پر بتا دیا کہ اُن پر قتلِ فرعونی کا ''الزام'' زبردستی عائد کیا ہے۔ حالانکہ اُن کا عمل عادلانہ احسان تھا۔ پس ایک ہی لفظ ''ذنب'' جب جائز الخطاء زلیخا کیلئے آئے گا تو خطائے عمد اور گناہ کے معنی دے گا؛ لیکن جُوں ہی خطائے عمد، جن کا صدور انبیاء علیہم السلام سے عقلاً ونقلاً اور اجماعاً جائز نہیں، کو موسیٰ علیہ السلام سے جوڑنے کی زبردستی جسارت کی جائے گی تو فوراً لفظ میں جوہری حرکت پیدا ہو کر لغوی معنی بدل کے اسے ''بے بنیاد تہمت و الزام'' بنا دے گی۔ یہ قرآن کے الفاظ کا زندہ معجزہ ہے عقل والوں کیلئے۔ اسے کوئی پیچیدہ جاہل نہیں سمجھے گا۔

مولوی حامد رضا: لفظ ''ذنب'' کے ''الزام'' ہونے کو آپ سورۃ فتح کی ان آیات پر کیسے اطلاق کریں گے؟

سیّد درویش: نبی علیہ السلام کی نسبت لفظ ذنب کو ''الزام'' مان لینے کے بعد ان آیات کا لغوی ترجمہ ایسے ہوا: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! ہم نے تمہیں صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کی صورت میں کھلی ہوئی فتح عطا فرمائی۔ اللہ اُن الزامات سے جو تم سے منسوب کیے جا چکے ہیں یا آئندہ منسوب کیے جائیں گے، محفوظ کر دے''۔

مولوی حامد رضا: کیسے الزامات؟

سیّد درویش: ایسے الزام جن کے ردّ میں تو آیت فتح المبین نازل کی گئی۔ اس آیت میں اہلِ عقل کی تنقیدی نظر اور تبصرے کیلئے عقیدہ تخطیہ الانبیاء علیہم السلام کے ابطال میں وحی، تاریخ اور حدیث کو قیامت تک قرآن کے مطالعہ میں اکٹھا کر دیا ہے۔ اب میں آپ کی توجہ کیلئے صحیح بخاری کی کتاب الشروط میں مسوُر بن مخزمہ اور مروان سے منقول حدیث پڑھ رہا ہوں۔ حدیث یوں ہے کہ جب سہیل بن عمرو (کافرین کا نمائندہ) آیا تو صلح نامہ لکھنے کیلئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کاتب کو بُلایا اور کہا کہ لکھو: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ سہیل کہنے لگا کہ خدا کی قسم ہم رحمن کو نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔ لہٰذا یوں لکھوایئے: ''**باسمک اللّٰھم**''؛ جیسا کہ آپ لکھا کرتے تھے۔ مسلمانوں نے کہا کہ ہم تو بسم اللہ الرحمن الرحیم ہی لکھوائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ (اس پر اصرار نہ کرو) ''**باسمک اللّٰھم**'' لکھ دو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: لکھو ''یہ وہ تحریر ہے جس کے مطابق محمد رسول اللہ نے صلح کی''۔ سہیل بولا کہ خدا کی قسم اگر ہم جانتے کہ آپ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں تو ہم آپ کو کعبہ آنے سے نہ روکتے اور نہ ہی آپ سے جنگ کرتے۔ لہٰذا آپ یہ لکھوایئے کہ میں محمد بن عبداللہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ خدا کی قسم بے شک میں اللہ کا رسول ہوں اور اگر تم میری تکذیب کرتے ہو تو محمد ابن عبداللہ لکھوا

دو۔ پھر فرمایا کہ لکھو ''اے کفارِ مکہ تم ہمارے اور کعبہ کے درمیان راہ صاف کر دو تا کہ ہم اُس کا طواف کر لیں''۔ سہیل نے کہا کہ خدا کی قسم ہم یہ بات اس سال منظور نہ کریں گے کیونکہ ہمیں خوف ہے کہ کہیں عرب یہ نہ کہیں کہ ہم مجبور کر دیئے گئے۔ البتہ آئندہ سال یہ امر ہو جائے گا۔ چنانچہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی لکھوا دیا۔ پھر سہیل نے کہا: یہ بھی لکھوا دیجئے ''کہ ہماری طرف سے جو شخص تمہارے ہاں آ جائے گا خواہ وہ تمہارے دین پر ہو، تم اس کو ہماری طرف واپس کر دو گے''۔ مسلمان بھڑک اُٹھے اور کہا: کیونکر مشرکوں کو جو مسلمان ہو چکا، وہ شخص لوٹا دیا جائے گا؟ اس ہی اثناء میں سہیل کا اپنا بیٹا ابوجندل اپنی بیڑیاں کھڑکھڑاتے ہوئے آیا اور خود کو مسلمانوں کے درمیان ڈال دیا۔ سہیل نے کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہی سب سے پہلی بات ہے جس پر ہم آپ سے صلح کرتے ہیں کہ تم ابوجندل کو میرے حوالے کر دو۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا اس ایک آدمی کی تم مجھے اجازت دو۔ سہیل نے انکار کر دیا۔ ابوجندل بول پڑا کہ اس نے اسلام کیلئے کیا کیا اذیتیں نہیں جھیلی۔ مجھے کیوں لوٹایا جا رہا ہے؟ حضرت عمر بن خطابؓ کہتے ہیں کہ پھر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے سچے نبی نہیں ہیں؟ فرمایا: ہاں۔ میں نے پھر پوچھا: تو کیوں ہم اپنے دین میں دبیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں خدا کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں اور میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا اور وہ میرا مددگار ہے''۔ اب میں نے کہا کہ کیا آپ ہم سے نہ کہتے تھے کہ ہم کعبہ جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے؟ فرمایا: ''ہاں! مگر کیا میں نے تم سے کہا تھا کہ ہم اس سال ہی کعبہ جائیں گے؟'' میں نے جواب دیا: نہیں! حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ پھر میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس گیا اور کہا کہ اے ابوبکرؓ! کیا یہ اللہ کے سچے نبی نہیں ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: ہاں! اُنہوں نے کہا: تم ان کی مخالفت نہ کرو، کیونکہ خدا کی قسم وہ حق پر ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ جب صلح نامہ کی تحریر سے فراغت ہوئی تو خدا کے

رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے صحابہ سے کہا کہ اُٹھو قربانی کرو اور سر منڈوا ڈالو۔ راوی کہتا ہے خدا کی قسم کوئی شخص بھی نہ اُٹھا۔ حالانکہ آپ نے تین بار دُہرایا۔

مولوی حامد رضا: یہ تو کھلم کھلی حکم عدولی کے مترادف ہوا۔

سیّد درویش: جو اپنی کتاب صحیح میں بخاری نے لکھا، میں نے بیان کر دیا۔ خیر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ آپ اُم سلمہؓ کے پاس گئے اور تمام واقعہ سنایا۔ اُنہوں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان میں سے کسی کے ساتھ کلام نہ کیجئے۔ آپ خود جانوروں کی قربانی دیجئے اور اپنا سر مونڈنے والے کو بلائیے۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ آپ قربانی دے چکے اور صحابہ بس دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد اُٹھے اور قربانی کرنے اور ایک دوسرے کے سر مونڈنے لگے۔

مولوی حامد رضا: اس واقعہ میں الزامات کی نوعیت کیسے ثابت ہوتی ہے؟ صحابہ کو تو صرف ایمان کی حرارت سے بھی غصہ آ سکتا تھا۔

سیّد درویش: ایمان کی حرارت سے قلب ٹھنڈا ہوتا ہے یا گرم آپ خود اپنے لیے فیصلہ کریں۔ لیکن اس کا کیا مطلب ہے کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کی نافرمانی شروع کر دیں؟ کیا نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اتباع و اطاعت ایمان کے گرم سرد موسموں سے مشروط ہے؟ معیار اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے یا آپ کی ایمانی گرمی سردی؟ کیا ایمان اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے علیحدہ ہے؟

پس پہلا الزام یہ تھا کہ اصحاب بیعت الرضوان نے پیغمبرانہ فراست و دُور اندیشی کو مسترد کرتے ہوئے شرائطِ صلح کو اسلام اور مسلمانوں کیلئے داغِ ذلت سمجھا اور ان کو ''شکستِ اسلام'' گردانا۔ اُن کے ہاں آپ ''تدبیری کوتاہی'' کے مرتکب ہوئے۔

مولوی حامد رضا: انوکھی منطق ہے۔ حالانکہ جب صلح کے بعد جنگ کا خاتمہ ہوا، تو لوگ بے خوف و خطر آپس میں تبادلہ خیالات اور مکالمہ کرنے لگے۔ جس کسی میں جتنی

عقل تھی اُس کے مطابق اسلام قبول کیا جانے لگا۔ صرف ان 2 سالوں میں اتنے لوگ مسلمان ہوئے کہ جتنے ابھی تک نہ ہو پائے تھے۔

سیّد درویش: دوسرا الزام ایسا ہے کہ جس میں ہمیں نظریہ تخطیہ الرسول کا بیج مل جائے گا۔ جب سہیل بن عمرو کے کہنے پر آپ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسول اللہ کی جگہ محمد ابن عبداللہ لکھے جانے پر رضامند ہو گئے، تو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ یہ صلح آپ خدا کے حکم سے نہیں بلکہ اپنی صوابدید و فراست سے کر رہے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر صحابہ کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ اس فیصلے میں چونکہ آپ نے دب کر دشمنوں سے صلح حدیبیہ کر لی، اس لیے یہ آپ کا فیصلہ وحیٔ الٰہی کی بجائے بشری اجتہاد پر مبنی ہونے کی وجہ سے غلط تھا۔

اس طرح صلح حدیبیہ قرآن میں فتح المبین قرار پا کر اس حقیقت پر دال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت کو دوہائی کرنا باطل ہے۔ اس آیت نے آئندہ تا قیامت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دو حیثیتوں میں بانٹ کر اجتہادی الزامات کا جو دروازہ نظریہ تخطئہ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کھلا، وہ ہمیشہ کیلئے بند کر دیا۔ پس نظریہ تخطیہ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ابطال، ہم آیت فتح المبین کے آئینے میں بے نقاب دیکھ سکتے ہیں۔ اسلام میں Protestantism کی بنیاد یہ ہی نظریہ ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دُور ہی میں اس کا اجراء ہو گیا۔ حدیث ثقلین کی انکاری نے اس کا قیام پکا کر دیا۔

پس دو الزامات صلح حدیبیہ کے موقعہ پر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت کے مطلق ہونے پر داغے گئے۔ پہلا ضمنی نوعیت کا تھا کہ آپ نے ناقص اجتہاد کیا۔ دوسرا اساسی نوعیت میں ابلیسی ہے کہ آپ کی بشری صورت و شخصیت، نبوتی عصمت سے خارج ہے۔ یہ دوہریت ہمیں عیسائی مذہب کے فرقہ نستورین ازم Nestorianism میں ملتی ہے۔ اب تیسری نوعیت کا ضمنی الزام مکہ کے کفار نے بھی آپ پر عائد کیا۔

مولوی حامد رضا: وہ کیا تھا؟

سیّد درویش: کہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اکیلا خدا اُن کے 360 معبودوں کی مجموعی طاقت اورنفرت کا سامنا نہیں کر پائے گا۔

مولوی حامد رضا: یعنی دو ضمنی اور ایک اساسی الزام نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لگایا گیا۔

سیّد درویش: جی ہاں! کیا آپ نے غور کیا کہ کفارِ مکہ نے جو الزام عائد کیا وہ وقتی، بیرونی اور ثانوی نوعیت کا تھا۔لیکن جو خود مسلمانوں سے الزاماتی خطاء سرزد ہوئی، اُس کی نوعیت مستقل، داخلی اور اساسی تھی۔یعنی کفار اساسی نوعیت کا الزام نہ لگا سکے۔ دیکھیں اس کے اثرات آج بھی مرتب ہیں۔آج بھی ہم اُسی Protestant نظریہ تخطئۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابطال میں اپنی توانیاں صرف کر رہے ہیں۔ساری حقیقت از زبان صحیح البخاری آپ کے سامنے کھل کرآ گئی ہے۔

پورے قرآن میں نبوتی عصمتِ مطلقہ کی فلسفی ترجمان اس سے زیادہ واضح کوئی آیت کسی تنقیدی اہلِ عقل کو نہیں مل سکتی۔یہ تمام انبیاء علیہم السلام کی عصمت کیلئے آئینہ دار ہے۔آیت فتح المبین وہ فانوس ہے جس کی کرنوں کا نورعصمتِ رسالت کے منافی نظریہ تخطئۃ الانبیاء علیہم السلام کے اندھیرے کی ظلمت کو مٹا کے رکھ دیتا ہے۔

مولوی حامد رضا: میرے لیے عصمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے کوئی ابہام نہیں رہا۔تاہم میں چاہتا ہوں کہ آخر میں آپ سورۃ انفال کی آیات 67-66 کے الفاظ کی معنوی تطہیر کر کے اہتمامِ حجت فرمائیں۔کیونکہ اللہ نے جنگِ بدر کے موقعہ پر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی بھیجی:''نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں چاہیے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو، جب تک خوب خونریزی نہ کرے ملک میں۔تم چاہتے ہو اسباب دنیا کا اور اللہ کے ہاں چاہیے آخرت۔اور اللہ زور اور حکمت والا ہے۔اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے تو تم کو پہنچتا اُس لینے میں بڑا عذاب''۔

پروفیسر امیر علی بولے:

پروفیسر امیر علی: متعدد بار مطالعہ کے باوجود مولوی صاحب آیت کے بنیادی مسئلہ کا میری سمجھ حل تلاش نہیں کر پائی۔ ذرا اس آیت کے پسِ منظر اور متن پر روشنی ڈالیں۔

مولوی حامد رضا: جنگِ بدر میں 70 مشرکین مارے گئے۔ اتنے ہی اسیر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مشورہ مانگا کہ اِن اسیران کو قتل کرنا ہے یا فدیہ وصول کیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ اور صحابہؓ نے فدیہ لے کر رہا کر دینے کا مشورہ دیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اور چند صحابہ کرامؓ نے قتل کی رائے دی۔

پروفیسر امیر علی: مسئلہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ مشورہ مانگنے کی ضرورت کیوں درپیش ہوئی؟ جبکہ قتل کا میدان اور وقت تو جنگ کا موقعہ ہوتا ہے۔

مولوی حامد رضا: حضرت عمرؓ کی سوچ یہ تھی کہ اگر ان قیدی راہنماؤں کو قتل کر دیا جائے تو مشرکین کا نہ صرف زور ٹوٹ جائے گا بلکہ مسلمانوں کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ لیکن رحمت العالمین نے فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔ اب ہوا یہ کہ دوسرے دن عمر ابن خطابؓ خدمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں حاضر ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ اور ابوبکرؓ رو رہے ہیں۔ پوچھا: کیوں؟ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بولے کہ ''فدیہ لینے پر میرے اصحاب پر جو عذاب نازل ہونے والا تھا، وہ مجھے اس درخت سے بھی قریب تر دکھلایا گیا ہے۔ اگر وہ نازل ہوتا تو سوائے سعد ابن معاذؓ اور عمرؓ کے کوئی نہ بچ پاتا''۔

امام بیضاوی کہتے ہیں کہ یہ آیت دال ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے غلط اجتہاد پر۔ چنانچہ اپنی تفسیر میں یوں قلمبند کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دو ایسے اعمال سرزد ہوئے جن کی بابت کوئی حکم از خدا صادر نہ ہوا تھا۔ ایک تو (بدر میں) فدیہ لینا، دوسرا (تبوک کے موقعہ پر) منافقین کو جنگ میں شریک نہ ہونے کی اجازت دے دینا۔ دونوں باتوں پر اللہ نے ناراضگی ظاہر کی۔ مدارج النبوۃ میں بھی یہ ہی حدیث ابن عما الیمانی سے مروی

ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ”اگر نازل می شد ما عذاب، نجات نمی یافت از ما مگر عمرؓ“۔ یہ ہی صحیح مسلم میں ہے۔

سیّد درویش: جب عترتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو چھوڑ کر عکرمہ ابن عماالیمامی سے احادیث لو گے۔ جب راسخون فی العلم کے در کو چھوڑ کر بیضاوی اور زمخشری سے آیات کی تفسیر پوچھتے پھرو گے؛ تو ایسے ہی سفید جھوٹ دین میں انفاق، تفرقات اور جماعت بندیاں کرواتے جاؤ گے۔ یہ انسان کا نفسیاتی میلان ہے کہ وہ دنیاوی غلط فہمی میں جب دین کے نام پر خودی کے سرکش گھوڑے پر سوار ہو جایا کرتا ہے تو اُس کو اپنا چہرہ خود فریبی کے آئینے میں حق کا خورشید ہی نظر آئے گا۔

میں آپ کو ڈاکٹر علی شریعتی شہید کا دورانِ تعلیم، جب وہ سُوربن کے کیفے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا، ایک قصہ سناتا ہوں۔ وہ بتاتا ہے کہ وہی صبح کا تازہ اخبار اُس ہی میز پر بیٹھا ایک یہودی طالب علم بھی پڑھ رہا تھا۔ شریعتی انقلابِ الجزائر کے حالاتِ حاضرہ کے مطالعہ میں مگن تھا۔ جب اچانک اُس کی نظر اُس دوسرے سے دو چار ہوئی جو کرنسی کے ریٹ دیکھ رہا تھا، تو دونوں ایک دوسرے کو احمق کہہ رہے تھے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کسوٹی کون متعین کرے گا؟

مولوی حامد رضا: صرافاں ہی سونے کی قدر کا معیار جانتا اور بتائے گا۔

سیّد درویش: اب عکرمہ ابن الیمانی کی سنیئے۔ علامہ ابن حزم کہتے ہیں کہ یہ حدیث ہی وضعی ہے۔ اور اس سے تو روایت کرنا ہی جائز نہیں۔ اب بیضاوی صاحب بھی کچھ کم علامہ تو نہیں۔ بس آیت سمجھو ایک بار پھر دو علاموں میں پھنس گئی۔ ابن حزم کا کہنا ہے کہ عذابِ عظیم والی آیت میں صرف مسلمین کو خطاب ہے، اس کا نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کچھ لینا دینا نہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، ہرفن مولا، اپنی ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں رقم کرتے ہیں کہ ”مجاہدینِ بدر کو قیدی بنا کر مشرکین سے فدیہ لینے کی رغبت تھی۔ اللہ کی مرضی کے خلاف،

جو چاہتا تھا کہ مشرکین کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جائے۔ اس رغبتِ مال کی وجہ سے مجاہدین پر عتاب کیا گیا۔

مولوی حامد رضا: عجیب بات ہے! بلکہ پریشان کن امر ہے کہ آیت کا مفہوم اُلٹا کر تاریخی حقائق کے خلاف سارا اجتہاد کے نام پر بوجھ رسول اللہ کے سر تھونپا جا رہا ہے۔

سیّد درویش: اسی واسطے تاریخ کا صحیح، دیانت دار اور تنقیدی مطالعہ آیاتِ قرآنی کو سمجھنے کیلئے حدیث کے علم کی طرح لازم ہے۔ چنانچہ قرآن نے تاریخی واقعات میں ماضی، حال اور مستقبل کو دائمی حکمتِ الٰہیہ میں اکٹھا کر کے اہلِ فکر و دانش کیلئے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ حقیقت اپنی اصل میں تبدیل نہیں ہوتی بلکہ مختلف رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہمیں دائمی حق کو وقتی حالات میں پہچاننا چاہیے اور حق کے مستقل معیار ہونے کا احقاق کرنا ہوگا۔

اب ہمیں اِن انفال کی آیات کو صحیح قرآن فہمی کیلئے حدیث، عقل اور تاریخ کی تنقیدی منشور سے گزار کر حقیقت شناسی کی طیف حاصل کرنا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ سارا معاملہ آیت کے اس فقرے میں ہے: ''اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے''۔ پروفیسر صاحب نے بڑے اہم سوالات اُٹھائے۔ یہ سمجھنا اشد ضروری ہے کہ آیا جہاد کے حکم صادر کرنے سے پہلے قدرت نے اسیرانِ جنگ کیلئے کوئی ہدایات کا بندوبست نہیں کیا تھا؟ کیا رسول اللہ اور اللہ بھی، یہ نہ جانتے تھے کہ جنگوں میں اسیری بھی ہوتی ہے؟ کیا رسول اللہ منتظر تھے کہ چلو پہلے جنگ کر لیں پھر سوچیں گے؟ اجتہاد تو تبھی ہوگا نہ جب پہلے سے خبر نہ خیال یا حکم موجود ہو۔ مجھے ان علماء لوگوں کی سمجھ نہیں آتی کہ کبھی کہتے ہیں کہ قرآن میں تا قیامت سارا علم موجود ہے۔ یومِ میثاق الانبیاء علیہم السلام بھی تسلیم کرتے ہیں۔ پھر بار بار یہ اجتہاد اور وہ بھی ناقص، کرنے

کی ضرورت درپیش ہی کیوں آتی ہے؟ کیا جبرائیل کی رفتار موقعے پر ضرورت کے وقت آنے کیلئے کم پڑ گئی، یا وہ مطلع ہی نہ کیے جاتے تھے؟ جنگ ہوگئی؛ قیدی بن گئے: اور ابھی تک وحی نہیں آئی؟ انتظار ہو رہا ہے اور وحی نہیں پہنچی۔ یہ کیسی غیر سنجیدہ سوچ ہے!

پروفیسر امیر علی: بے شک! یہ ہی امر محال ہے کہ تدبیرِ کائنات کرنے والے کے پاس خود جنگ سے بیشتر، اسیران کیلئے کوئی پروگرام ہی نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ جنگ ہے؛ تو ظاہری بات ہے قیدی بنتے ہیں: پھر اُن کا کرنا کیا ہے؟ جیسا کہ سیّد صاحب بیان کر چکے۔ میں حیران ہوں جو بیضاوی صاحب نے فرمایا۔

سیّد درویش: آپ امام بیضاوی ہوں کہ زمخشری یا رازی، ناموں سے متاثر و حیران نہ ہوں۔ حضرت علی کا قول ہے کہ ''یہ دیکھو کہا کیا ہے؟''

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے نص صریح کے تحت بنا کسی سے مشورہ طلب کیے، فدیہ لے کر قیدیوں کو بَری کر دیا۔

مولوی حامد رضا: آپ یہ کیسے صریحاً فرما سکتے ہیں؟

سیّد درویش: میں نے دورانِ بحث توجہ طلب فقرہ آیت میں بتا دیا کہ ''اگر نہ ہوتی اک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے'' ظاہر کر دیتا ہے کہ فدیہ لینے کا حکم تو جنگِ بدر سے پہلے ہی نازل ہو چکا تھا۔ پھر اللہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ کون سی بات تھی۔ یہ ہی کہ فدیہ لے لو۔ اسیران سے فدیہ لینا تو مقدمہ ہی نہیں، یہاں مذمت ہے میدانِ جنگ میں خونریزی نہ کرنے والوں کی۔

مولوی حامد رضا: اگر ایسی بات ہے تو کیا یہ حکم آیا؟

سیّد درویش: سورۃ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی چوتھی آیت میں، جو بدر سے پہلے نازل ہوئی، و جس میں صریحاً اللہ فرما چکا: ''جب کافروں سے تمہارا مقابلہ ہو تو اُن کی گردنیں مار دو، یہاں تک کہ جب تم انہیں مغلوب کر کے اپنی دھاک بٹھا لو تو اچھی طرح ان کی مشکیں

کَس لو۔ اس کے بعد یا احسان کر کے انہیں رہا کر دو یا فدیہ لے کر‘‘۔

مولوی حامد رضا: جنگِ بدر سے قبل کون سا یہ جنگ کا موقعہ تھا؟

سیّد درویش: آپ بخوبی واقف ہیں کہ غزوۂ بدر کوئی پہلی جنگ نہیں تھی۔ اس سے پہلے عبداللہ بن جحش، جو سریہ نخلہ بھی کہلاتا ہے، واقع ہو چکا تھا۔ اس میں عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان با قاعدہ اسیر ہوئے اور اُن کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔

پس رسول اللہ کو کسی اُمتی کے مشورے کی ضرورت نہ تھی کہ فدیہ لینا ہے یا ویسے ہی رہا کر دینا ہے۔ اصل مسئلہ ’’میدانِ جنگ‘‘ میں جو ہوا اُس کی مذمت یہاں پیش کی گئی ہے۔ اطاعت اور اتباعِ اُمت نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کرنی ہے، یا پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمت کے فیصلوں کی پیروی کرنا تھی؟ کیا اُلٹی گنگا بہائی جا رہی ہے! مولوی صاحب یہ آیت تو عدلِ الٰہی نے ظالمین کی برأت میں اُن کیلئے جنگ کے میدان میں جو نامناسب رویہ برتا، نازل کی۔

مولوی حامد رضا: ظلم کیسے؟

سیّد درویش: آپ نے خود ہی بتایا تھا کہ چیز کو اس کی اصل جگہ پر نہ رکھنا، ظلم کہلائے گا۔

مولوی حامد رضا: عقلی بات ہے۔

سیّد درویش: اور اس کی جگہ پر رکھنا عدل۔ مثلاً ہنسنا یا رونا جائز ہے کہ ناحق؟ اس کا فیصلہ موقعے کی مناسبت سے ہو گا۔ جب کسی کو غم آلیتا ہے تو آنسو اور ماتم ہی ’’فطرتی ردِّعمل‘‘ ہوں گے۔ یہ فطرتی ردِّعمل عقل کے مطابق عدل کہلائے گا۔ اچھا! اگر کوئی غم ناک موقعہ پر گیت اور رقص شروع کر دے تو یہ غیر مناسب ردّعمل کیا کہلانا چاہیے؟

مولوی حامد رضا: یہ ظلم تو دشمن ہی کرے گا۔

سیّد درویش: اگر کوئی شادی کے موقعہ پر نوحہ خوانی شروع کر دے تو یہ بھی غیر

معقول ردّعمل ظلم بن گیا۔ پس گیت یا نوحہ، ماتم یا رقص، جائز ہیں موقعے کی مناسبت سے؛ اپنے معقول ردِّعمل میں عدل کے مطابق۔ پس عقلی طور پر اگر عبادت بھی غیر معقول ہوتو ابلیس بنا دیتی ہے، حالانکہ وہ کوئی نوحہ خواں تھا نہ موسیقی یا رقص کا دلدادہ۔

پس اس آیت میں عدل تقاضا کر رہا ہے کہ میدان میں جم کرلڑو۔ ہاں قتال کے بعد میدان میں جو بقیۃ السیف ہوں، اُن کو گرفتار کر کے فدیہ لے کر یا بنا تاوان چھوڑ دو۔ اب جنگ اگر جاری ہو، اور کوئی تاوان کے شوق میں دشمن قیدی بنانا شروع کر دے، جیسے ماہی گیر مچھلیاں جال میں پھنسا کر اکٹھی کرنا شروع کر دیتا ہے، یا صیّاد پرندے پکڑتا ہے،تو آپ کیا سوچیں گے؟

مولوی حامد رضا: یہ تو ظلم ہوگا۔

سیّد درویش: بس یہ ہی اس آیت میں بھی رونا ہے۔ کیونکہ بدر کا میدان گرم تھا۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ کفار کے اہم رؤسا و اکابر کی اچھی صفائی کی جاتی۔ دُشمن کو مکمل طور پر گھائل کیا جاتا تا کہ وہ اُحد میں دوبارہ اُترنے کی جرأت نہ کرنے پاتا۔لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اُحد کے میدان میں بھی اُنہوں نے یہ ہی نافرمانی کر کے مالِ غنیمت قابو کرنے کیلئے دوڑیں لگا دیں۔ ایسا ہی یومِ بدر والے دن ہوا۔

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب ذرا تفصیل سے بیان کیجئے۔

سیّد درویش: طبری لکھتا ہے کہ مجاہدین نے اس منشائے قدرت کے خلاف اکابر قریش کو دیکھ کر یہ خیال کیا کہ تاوانِ جنگ حاصل کرنے کا بہترین موقع آ گیا ہے۔ اُنہوں نے قتلِ کفار میں پورا انہماک نہ دکھلایا بلکہ اُنہیں گرفتار کرنے کے درپے ہو گئے۔ جب مسلمان اس پکڑا دھکڑی میں مصروف ہو گئے،تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خیمے میں تشریف لے آئے۔ سعد بن معاذ اپنی انصار کی ایک جماعت کے ساتھ تلوار حمائل کیے حفاظت واسطے دروازے پر کھڑا تھا۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: کیوں خفا ہو؟ تو کہنے

لگے: ''بخدا! یہ پہلی لڑائی ہوئی ہے دل کھول کر قتل کرنا چاہیے تھا، بجائے ان کو زندہ رکھنے کے''۔

تو یہ وہ مجاہدین کی لالچ و رغبت تھی، جس کی بناء پر خدا نے انہیں کوسا ہے۔ عتابِ الٰہی کی شدت کا ذرا اندازہ کریں اس آیتِ مبارکہ میں کہ: ''اگر اس (فدیہ) کے متعلق خدا کا فیصلہ پہلے صادر نہ ہو گیا ہوتا تو فدیہ کی عرض سے جو گرفتاریاں تم نے کیں ان کی پاداش میں تم کو زبردست عذاب آلیتا''۔ اب ان سورۃ انفال کی آیات کو سورۃ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم):4 سے ملا کر دکھیں، مکھن سے بال کی طرح حقیقت باہر آ جائے گی۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب، علامہ طبری کے علاوہ بھی کسی اور بنیادی کتاب میں سعد بن معاذ کا یہ واقعہ ملتا ہے؟

سیّد درویش: سیرت کی اوّل کتاب ابن ہشام میں بھی درج ہے، لیکن دوسری خود ساختہ حدیث جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناقص مجتہد قرار دینے کے درپے ہے، اُس کا کوئی ذکر نہیں۔

مولوی حامد رضا: کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تنقیدی بصیرت سے عاری حضرات اپنی کوتاہ بینی سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو اپنے ناقص و قبیح سطح اجتہاد پر کھینچ اُترانے میں کوشاں ہیں۔ اپنا قیاس و اجتہاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماتھے پر لگا رہے ہیں۔

سیّد درویش: آپ نے شاید غور کیا ہو کہ کس طرح میٹھی بے باکی سے اس مقدس بھنور میں پھنسا رہے ہیں کہ صحابہؓ کے اجتہاد کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشری سوچ پر فوقیت حاصل تھی۔ یعنی اجتہاد اُن لوگوں کے نزدیک وحی سے بھی آگے کا علم جانتا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چُپ کر کے اُمت کے مشوروں کا محتاج بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وحی کی حیثیت تو پھر اجتہاد کی تصدیق کرنا ہی رہ گئی۔ اجتہاد پہلے، وحی بعد میں آتی ہے۔ حالانکہ وحی تو

سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آیت :4 میں آ چکی تھی۔

مولوی حامد رضا: اگر آپ نے سیّد صاحب تنقیدی اور تاریخی طور پر قرآن کی اِن لاریب آیات کے حقیقی معنوں پر بحث نہ کی ہوتی، تو بیضاوی جیسوں کی تفسیر برائے تفسیر کا آخری کیل میرے دل و دماغ میں ہی ٹھوکا رہنا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ''قرآن کافی ہے''۔

سیّد درویش: دیکھیں! قرآں کافی کہہ کر آپ اپنی رائے کا دروازہ کھولتے ہیں۔ جبکہ ''قرآن مکمل کتاب'' ہے درحقیقت؛ لیکن اُن کیلئے جو اس کے وارث ہیں۔ غیر معصوم اُمت کیلئے تاریخ، حدیث اور عقلی بصیرت اور تنقید کی ساتھ ساتھ ضرورت ہے۔ جو خود ساختہ Self- made راسخون فی العلم حضرات قرآن کو بنا حدیث، تاریخ اور عقلی تحقیق کے ہر بیماری کا علاج بتاتے ہیں؛ اصل میں عترت کے مُنکر، نرگسیت میں مبتلا، خود اثباتی کے مریض ہیں۔

حالانکہ تاریخ اور حدیث تو قرآن فہمی میں عقل واسطے تنقیدی مضامین ہیں۔ ان کو جھٹلانے کے بعد نرگسیت کے پاس خود اثباتی کیلئے فقط دو ہی ذرائع باقی بچ جاتے ہیں: (i) کشف (ii) قیاس۔ اس بنا جاگ کے، جو اہل بیت علیہم السلام، گھر والوں سے ہی ملے گی، دودھ سے مکھن نکلنے والی خودی کی نرگسی سائنس کا Code Word انہوں نے ''قرآن کافی'' رکھا ہوا ہے۔ مطلب من مانی۔ حال یہ ہے ان کے یقین و علم کا کہ بس اِدھر آپ نے اِن سے پوچھ لیا کہ چلو بتاؤ سورۃ البقرہ کے شروع میں 'ا۔ل۔م، کا مطلب کیا ہے اور 'وہ، 'ذالک الکتاب، کون سی اور کدھر ہے وہ کتاب: سمجھو حروفِ مقطعات اور ذالک کے سوال کو ہی غائب کرنے کیلئے 'ھٰذا، لگا کر ''یہ وہ'' کا ایسا پنڈورا بکس کھولیں گے کہ اب ہر طرف صرف یہ ہی یہ ہوں گے۔

مولوی حامد رضا: لیکن یہ نظریہ تو غلام احمد پرویز صاحب کا ہے۔

سیّد درویش: یہ اُن کی ایجاد نہیں، بلکہ منفرد دریافت کہہ سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں صفین میں خوارج، جو Henri Lammens کے بھی نظریاتی محسن تھے، قرآن کو نیزوں پر چڑھا کر نفسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدِّ مقابل لے کر نکل آئے تھے۔ بس سمجھ لو کہ ایک وہی والا پرویز صاحب بھی اُٹھا لائے ہیں۔ مطلب اہل بیت علیہم السلام کو ماننا جو نہیں! حالانکہ صامت جلد کیا بولے گی، نہ اعتراض کرتی ہے؛ ناطق جو نہیں۔ جو چاہو مطلب نکال کر اپنی رائے و قیاس پر حق کا ٹھپا کسی بھی آیت کو حوالہ متن سے نکال کر چسپاں کر لو۔ نہ حدیث کی قید، نہ تنقید کے تحت، نہ تاریخ کی پابندی۔ بس قیاس کی کھلی فضا ہو؛ کشف کے لمبے لمبے پَر؛ تو پھر تفویض اور اجتہاد کی پروازیں! کبھی اِدھر، کبھی اُدھر۔

معراج کیلئے تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے اللہ تعالیٰ نے پروں والا گھوڑا بُراق بھیجا: لیکن اِن حضرات کو وہ کیوں چاہیے؟ کیونکہ اُن کے پاس اپنا ہی قیاس کا ایسا نرگسی اسپ ہے کہ جب چاہا، سمجھو معراج پر۔ نہ کسی اُذنِ الٰہی کا اجازت نامہ؛ نہ کسی مشیتِ الٰہی کی رکاوٹ۔ بس لکھو جو لکھنا ہے؛ کہو جو کہنا ہے۔ آزادی، حُریت، شعور اور انسانیت کے نام اور بہانوں سے خودی کی سرکشی کے شوق میں۔

ٹائن بی (Toynbee) نے ان کیلئے بڑی خوبصورت اصطلاح ساز کی ہے کہ یہ لوگ Do-as-you-likes ہوتے ہیں۔ ان میں ہر کوئی منصور حلاج ہوتا ہے، لیکن کہنے یا تسلیم کرنے سے ڈرتا یا شرماتا ہے۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب سوال یہ پیدا ہوتا ہے بلکہ اعتراض، کہ قرآن نے ایسی دقیق زبان استعمال ہی کیوں کی کہ ان مفسرین، قرآنی Doasyoulikes کو موقعہ ملا کہ وہ آیات عصمت الانبیاء علیہم السلام کو عوام کیلئے مبہم بنا دیں؟

سیّد درویش: دیکھیں قرآن کے پاس علم ہے ازل سے وجود میں آنے والی

حقیقت کا۔ اس کو قیامت تک ہدایت دینا ہے۔ لیکن اس کے پاس صرف 23 سال کے چند لمحات ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟ تو قرآن نے اشاروں میں بات کرنا شروع کر دی؛ تا کہ بنا وقت ضائع ہوئے پیغام عقلمندوں کو پہنچ جائے۔

اب یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ قرآن محاورات و اسالیبِ عرب کے مطابق نازل ہوا۔ عہدِ نزول میں اہلِ عرب میں جب کسی بات کو زیادہ مؤثر بنانا مطلوب ہوتا تو اسلوبِ بیان یہ تھا کہ وہ اس کا مخاطب کسی قریب ترین عزیز یا محبوب ترین دوست کو کرتے تھے، جبکہ مقصود کوئی دوسرا ہوتا۔ یہ ایک Indirect Speech ہوتی۔ عربی ضرب الامثل ہے کہ ''ایاک عنی و اسمعی یا جارہ''۔ مطلب یہ کہ ''اے پڑوسن! میں تجھ سے کہہ رہی ہوں'' مخاطب کوئی اور ہے۔ جلال الدین سیوطی اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں قرآنی مخاطبہ کے 34 طریقے بیان کرتے ہیں۔ 33 واں یہ والا ہے: ''مخاطب سردار ہو اور مراد لوگ ہیں''۔ پس آیات کے مضمون کو اور بھی مؤثر بنانے کیلئے مخاطب رسول اللہ، تو مراد مسلمان اُمت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ شُبہ عدمِ معرفتِ منصبِ رسالت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے جیسا قیاس کرے گا تو سمجھو نوع کی نہ سمجھی، تقصیریت کی مہلک مرض سے دوچار ہو چکی ہے۔

مولوی حامد رضا: میں چاہتا ہوں کہ آپ کھول کر اس مرض کو سامنے لائیں، تا کہ لسانِ الٰہی کی یہ راز کشائی ہمارے لیے علاج ممکن کر سکے۔

سیّد درویش: سورۂ شعراء، آیت: 213 میں اللہ فرماتا ہے کہ: ''اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! تم خدا کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکارنا ورنہ مبتلائے عذاب ہو جاؤ گے''۔ سورۃ زمر میں یوں آواز آتی ہے۔ آیت 64 اور 65 یں: ''تمہاری طرف اور تم سے پہلے انبیاء (علیہم السلام) کی طرف یقیناً یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر کہیں تم نے بھی

شرک کیا تو تمہارے سارے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور تم ضرور گھاٹے میں آ جاؤ گے"۔

ان آیات میں قرآن کے اسالیبِ تخاطب سے جو ناواقف ہیں اُن کو عقلی دھوکہ ہو جاتا ہے، یا پھر عقلی سزا، اس کا فیصلہ ہمارا یہاں مسئلہ نہیں۔ تاہم ایسے نرگسیت زدہ پڑھے لکھے جاہل، متشابہہ آیات کو فروغ دینے کیلئے اپنی نفسیاتی تشفی کیلئے Positivism کو بڑھ چڑھ کر استعمال کر کے سادہ لوح، سطحی عوام میں علمیت کے سرغنے بن جاتے ہیں۔

مولوی حامد رضا: کوئی شخص جو عقل وفہم رکھتا ہو، وہ علامہ سیوطی کے بیان کردہ اس قرآنی اندازِ کلام کا انکار کرنے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ آپ نے نہایت مؤثر طور پر خاتم النبیین علیہ السلام کی عصمت، معاشرتی معاملات میں ثابت کر دی ہے۔ لیکن سیّد صاحب ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرت کے علاوہ، خود نبی علیہ السلام کی داخلی معصومیت ثابت نہیں ہوتی۔ اس کی واضح مثال حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ہے؛ جب کوئی معاشرتی زندگی نہ تھی۔ آپ اکیلے اپنی ذات میں انسان تھے۔ حوّا تو آپ ہی کی خواہش کا عورت کی صورت میں نام تھا۔

سیّد درویش: (ہنستے ہوئے پوچھتے ہیں) کیا معاشرتی اُمور کے صُدور میں ذات، فکر کا مرکز نہیں ہوتی؟

مولوی حامد رضا: میرا مطلب تھا کہ تخلیق سے پہلے ہی جب آپ ابھی زمین پر اُترے بھی نہ تھے، تو آپ کا قصہ ذاتی طے پا گیا۔ معاشرے کی تشکیل تو ابوالبشر کے جنت سے نکالنے کے بعد زمین پر ہوئی۔ لفظوں کی بحث میں اُلجھے بغیر استدلال کیلئے کافی نہیں کہ آدم علیہ السلام کا زمین پر نہ صرف آنا، بلکہ آ کر معافی اور بخشش کا طلب گار رہنا، نبی علیہ السلام کو ذاتی حیثیت میں قابلِ خطاء وگناہ ثابت کر دیتا ہے۔ آپ نے علامہ

سیوطی کے ''ایاک اعنی'' والے اسلوبِ بیان اور اپنے نظریہ ''لفظی حرکتِ جوہری''
سے انبیاء علیہم السلام کی عصمت کو کامیابی سے معاشرتی جہت میں ثابت کر دیا؛ لیکن نبی
علیہ السلام ذاتی طور پر، حقیقتِ آدم علیہ السلام کی رُوح سے مبرا از خطاء نہیں ہے۔

سیّد درویش: خدا خدا کر کے ہم بشری اور نبوتی دوھریت سے نکل رہے ہیں:
آپ نے نبی علیہ السلام کو ذاتی اور معاشرتی شکل میں آ جکڑا ہے۔ حالانکہ اصل رُوح
وہی ہے سوال کی، جو ظاہر میں مختلف نظر آتی ہے۔

خیر بائیولوجسٹ کی طرح، جو کثیر خلیاتی جاندار کو جس طرح یک خلوئی جاندار میں
مطالعہ کرتے ہیں: آپ عصمتِ نبوی علیہ السلام کو معاشرت سے نکال علیٰحدہ کر کے
ذات میں جاننا چاہتے ہیں۔ لیکن نہایت نازک، دقیق اور بڑے غیر مرئی نتائج کا حامل
سوال آپ نے پوچھا ہے۔ ایسا رکیک اور زیرک کہ اگر ذاتی عصمت ہی مطلق نہ رہی تو
معاشرتی غیر اُصولی بن کر رہ جائے گی۔ حالانکہ عصمت آدم علیہ السلام تو داخلی جہت
Innate Dimension ہے، عصمت الانبیاء علیہم السلام کی معاشرتی صورت
Social Spectrum میں۔ اسی داخلی جہت کیلئے ہی تو میں نے ''لفظی حرکتِ
جوہری'' کا نظریہ آغازِ گفتگو میں ہی پیش کرنا شروع کر دیا۔ اگر آپ نے لفظی حرکت
کے استدلال میں جوہرِ ذاتی کا ادراک کر لیا ہوتا تو اس سوال کی آپ کو ضرورت ہی
درپیش نہ آتی۔ کیونکہ مالٹے کے جوہر، بیج میں ''حرکاتی نشوونما'' کے دوران مالٹا ہی برآمد
ہوگا؛ کبھی آم پیدا نہیں ہوتا۔ مطلب جو ذات اپنے جوہر میں پاک ہوگی، وہی معاشرتی
حرکت میں تطہیر ظاہر ہوتی ہے۔ جو ہوتی ہے وہی ثابت بھی ہوگی۔ یہ ذات کا باطن ہی
معاشرے کی تعلیم و ہدایت کیلئے اپنی جوہری حرکت کے بعد الفاظ میں ظاہر ہوتا ہے۔
پس آپ کے ہاں ابھی معنیٰ کا ادراک باقی ہے، اگرچہ عصمتِ انبیاء علیہم السلام کی جوہری
حرکتِ الفاظ آپ استدلال میں سُن اور تسلیم کر چکے۔ یعنی آپ اب قصہٴ آدم علیہ السلام

میں رُوحِ الفاظ کو وحی کے معنی میں تلاش کرنے کے خواہاں ہیں۔

مولوی حامد رضا: ایسا ہی ہے۔

سیّد درویش: تو پھر یہ بتائیں کہ آدم علیہ السلام کا قصور کیا تھا، جو آپ اُس کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟

مولوی حامد رضا: آپ نے گندم کھالی۔

سیّد درویش: آپ تو ہر روز دن میں تین مرتبہ کھاتے ہیں۔

مولوی حامد رضا: لیکن آدم علیہ السلام کو منع تھی۔

سیّد درویش: اچھا یہ عجیب تکرار ہے! عیسائی شور مچا رہے ہیں کہ آدم علیہ السلام سیب کھا گیا۔ آپ کہتے ہیں نہیں؛ وہ اللہ سے چوری چوری اناج کھا گیا۔ مطلب چوری کا الزام ہی ایک لحاظ سے عائد ہوتا ہے۔ (پروفیسر صاحب کے ساتھ مولوی صاحب بھی مسکرانے لگے)

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب اسلامی روایات میں تو گندم کو ہی شجرِ ممنوعہ قرار دیا گیا۔

سیّد درویش: کیا گندم کا درخت ہوتا ہے؛ مطلب شجر پر اُگتی ہے؟ دوسرا گندم کھانا قطعاً ممنوع، گناہ ہے؟

مولوی حامد رضا: اللہ بہتر جانتا ہے کہ گندم کیوں شجرِ ممنوعہ تھی۔ باقی گندم تو ہماری روزمرہ کی غذا ہے۔

سیّد درویش: تو وہاں کیوں کھانا گناہ تھی اور یہاں جائز؟

مولوی حامد رضا: وہاں حکمِ الٰہی تھا۔ یہاں نہیں۔

سیّد درویش: مطلب یہ کہ جو وہاں گناہ تھا، یہاں جائز ہے۔

مولوی حامد رضا: بے شک!

سیّد درویش: سوچ لیں؛ ایسا نہ ہو کہ آپ کو بھی گندم ہضم نہ ہو۔ ویسے آپ کی اس گفتگو سے نہ جانے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ بھی فیثاغورث کی طرح پڑھتے زیادہ اور سوچتے کم ہیں جو ہر قلیٹس کہتا تھا۔ (سیّد صاحب قہقہہ دار ہنسنے لگے، مولوی صاحب جو خفیف سا پریشان ہو گئے، بولے:)

مولوی حامد رضا: اس میں سوچنے والی کیا بات ہے۔ صاف صاف اللہ کا حکم تھا۔ حالانکہ یہاں ہر کوئی گندم کھاتا ہے کیونکہ منع نہیں، جیسے خنزیر کا گوشت۔

سیّد درویش: یعنی جو اللہ کا حکم ہوتا ہے اس میں سوچنا، غور و فکر کرنا منع ہے۔ لیکن اللہ تو انسانوں کی عقلی صلاحیت کو مخاطب اور دعوت دیتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ عقل حکمِ الٰہی کے مخالف ہوتی ہے۔ یہی تو اہلِ کلیسا کا بھی کہنا ہے۔ آدم علیہ السلام کا قصہ بھی کیا امتزاج ہے اہلِ کتاب اور مسلمان علماء کے ظاہری اختلاف میں۔

مولوی حامد رضا: ظاہری اختلاف کیسے؟ اور پھر امتزاج کیوں؟

سیّد درویش: آپ کہتے ہیں کہ گندم کھائی اور آدم علیہ السلام نیچے آ پہنچا۔ وہ کہتے ہیں کہ سیب کھا لیا اور جنسی شعور آ گیا؛ پس شعور کی پاداش میں نیچے نکال پھینکا گیا۔ بات تو ایک ہی ہوئی نہ کہ جنت میں بچے پیدا نہیں ہونے تھے۔ جبکہ گندم اور سیب یہاں کھاتے جاؤ اور بچے بناتے جاؤ۔ فرق اتنا ہے کہ اہلِ کتاب یہ بات کہتے ہیں اور مسلمان یہ بات کہتے نہیں۔

اچھا اللہ کے منع کردہ شجر سے کھا کر آدم علیہ السلام نے اپنے ہی نفس کو ظلمت میں ڈال لیا۔ ایسا ہی ہوا؟

مولوی حامد رضا: جی اُس نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔

سیّد درویش: مجھے یہ جواب دیں کہ آیا زمین والوں کیلئے اپنے نفس پر کسی قسم کا ظلم کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

مولوی حامد رضا: نفس پر ظلم رواں رکھنا کسی صورت میں جائز نہیں۔ نہ یہاں، نہ وہاں۔ کیونکہ یہ حق بات ہر جگہ اور وقت ایک سی ہے۔

سیّد درویش: پھر بات گندم اور سیب یا انگور کی تو نہ رہی۔ بات تو اصل میں نفس پر ظلم کرنے کی ٹھہری۔ شاید آپ میری موسیٰ علیہ السلام والی مثال بھول رہے ہیں؛ ورنہ آپ یہ سوال دُہراتے ہی کیوں۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرح آدم علیہ السلام کی نسبت لفظ ظلمِ نفسی اپنی جوہری حرکت میں معنی تبدیل کر لیتا ہے۔ مولوی صاحب لگتا آپ کو گندم اور سیب کوئی پسند نہیں۔

مولوی حامد رضا: یہ تو اللہ کی نعمتوں میں شامل ہیں، میں کیوں کفرانِ نعمت کروں گا؟

سیّد درویش: کیا اللہ کی نعمتوں سے مستفید ہونا نفس پر ظلم کے مترادف ہوتا ہے؟

مولوی حامد رضا: یہ تو عقل کے منافی سوچ ہے۔

سیّد درویش: مجھے اب کسی طرح تسلی دیں کہ جنت میں نعمتوں سے لطف اندوز ہونا واقعاً خدا نے نفس پر ظلم کے مترادف ٹھہرایا۔

مولوی حامد رضا: سورۃ طٰہٰ :121 میں صریحاً ارشادِ خداوندی ہے: ''وعصٰی آدم ربہ فغوی'' کہ ''آدم نے رب کی نافرمانی کی''۔

سیّد درویش: نافرمانی سے آپ کی کیا مراد ہے؟

مولوی حامد رضا: آدم علیہ السلام کی نافرمانی کسی ''گناہ کبیرہ'' کے زمرے میں نہیں آتی، بلکہ یہ فقط ''ترکِ اولیٰ'' کہلوائے گا۔

سیّد درویش: مطلب یہ کہ آدم علیہ السلام نے گندم کھا کر ترک اولیٰ کا ارتکاب کیا۔ لیکن عیسائی کہتے ہیں کہ سیب کھانے سے نافرمانی کا مطلب ''گناہِ اوّل'' The Original Sin ہے۔ یعنی آپ کے نزدیک نافرمانیٔ آدم علیہ السلام ''ترک اولیٰ''

ہے جبکہ اہلِ کتاب والے اس کو ''گناہِ اوّل'' کہتے ہیں۔ لفظ ایک؛ کام ایک؛ لیکن مفہوم دو۔

مولوی حامد رضا: آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟

سیّد درویش: مجھے آپ کے نظریہ ''ترک اولیٰ'' میں عیسائی عقیدے ''گناہ اوّل'' کی بُو آتی ہے۔ دیکھیں آدم علیہ السلام کو اللہ نے باقاعدہ عضوتناسل کی ایسی نعمت سے نوازا جو نہ ابلیس کے پاس تھی نہ ملائکہ کے نصیب میں آئی۔ کتنا واضح فرق اللہ نے اپنے خلیفے کیلئے رواں رکھا۔ یہ باقاعدہ خلیفۂ الٰہی ہونے کی نشانی قرار پائی۔ تو آیت میں ابراہیم کو کثیر اولاد کی خوشخبری دی گئی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے قبیلے ہی بنواسرائیل میں بدل گئے۔

تو ''نعمتِ عظیم'' کو عیسائیوں نے گناہ اوّل بنا کر رکھ دیا۔ میں اب آپ کی توجہ اس امرِ عظیم کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ کہیں آپ نے بھی تو ''نعمتِ خلافت'' کا نام ترک اولیٰ تو نہیں رکھا ہوا؟ کیونکہ خلیفہ آدم علیہ السلام کے پاس وہ کاری آلہ تھا جس کے استعمال کو عیسائی ''گناہ اوّل'' قرار دے چکے۔ اگر آدم علیہ السلام جنت میں ہی آرام سے بے اولاد رہتا تو نیچے آنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ کیا خلافت فی الارض بھی خطاء یا گناہ کے عوض ہی بطور سزا ملی؟ تو یہ ہے وہ غیرمرئی تعلق عیسائی علماء اور اُن کے رفقاء مسلمان علماء میں۔ آپ کی اس سلسلے میں اب کیا رائے ہوگی؟

مولوی حامد رضا: احکامِ الٰہی دو قسم کے ہوتے ہیں: (i) حکم ارشادی (ii) حکم مولویت۔ حکمِ ارشادی وہ ہے جس کی مخالفت حرام اور موجبِ عتاب نہیں۔ مطلب وہ کام بذاتِ خود غلط نہیں بلکہ نتائج غلط مرتب ہوں گے۔ جبکہ مولویت والا حکم یہ ہے کہ عبد کو مولیٰ کا حکم ضروری ماننا ہے۔ اطاعت واجب ہے۔ خواہ اس کی مصلحت کا علم ہو نہ ہو۔ مثلاً نماز پڑھو۔ حکم مولوی کی مخالفت عصمت کے منافی ہے اور عذاب کا استحقاق ہوگا۔

چنانچہ آدم علیہ السلام کو حکم مولوی نہیں بلکہ حکم ارشادی جاری ہوا تھا۔

ان احکام میں فرق جاننے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی نافرمانی چونکہ حکم ارشادی کی بناء پر تھی، اس لیے یہ گناہِ اوّل نہ تھا بلکہ ترک اولیٰ تھا۔ ترک اولیٰ ہمیں بتاتا ہے کہ نبی علیہ السلام جتنا اخلاقی طور پر اعلیٰ درجے پر فائز ہوتا ہے، اُس کے مطابق ہی ترکِ اولیٰ نافرمانی شمار ہوتی ہے۔ مطلب جس کی اُمید نہ ہو، وہ اس سے سرزد ہو جائے۔

سیّد درویش: آپ کہنا چاہتے ہیں کہ علماء حضرات نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ یہ ترک اولیٰ کے نام کا دُم چھلا اُترنے نہیں دینا۔ اُن کے ہاں انبیاء علیہم السلام اور آدم علیہ السلام کی عصمت وعظمت کو متعارف کروانے کیلئے یہ قبیح اصطلاح مؤثر ترین پائی گئی ہے۔

مولوی حامد رضا: میں سمجھا نہیں۔

سیّد درویش: (ہنس کر) وہ کیا کہتے ہیں پنجابی میں کہ آملوں کا سواد اور دوستوں کی نصیحت کا آہستہ آہستہ پتہ چلتا ہے۔ فی الحال اتنا کافی ہے کہ آپ نے کہا، حکم مولوی اور ارشادی میں وہی فرق رواں جاننا چاہیے جو حلال اور مستحب، حرام اور مکروہ میں پایا جاتا ہے۔

مولوی حامد رضا: ہم کہہ سکتے ہیں۔

سیّد درویش: کیا ہم اس کو ''قیاس اولویت'' اور ''قیاس منصوص العلۃ'' بھی کہہ سکتے ہیں؟

مولوی حامد رضا: کیا مطلب؟

سیّد درویش: یعنی ابلیس نے قیاس اولویت کیا۔ جبکہ آدم علیہ السلام والا قیاس، قیاس منصوص العلۃ تھا۔

مولوی حامد رضا: یہ بھی ٹھیک، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ ہیں۔

سیّد درویش: آپ کے نزدیک دونوں ہی قیاسی تھے۔ لیکن عملِ آدم علیہ السلام مستحب اور مکروہ تھا، جبکہ ابلیس کا حلال کے خلاف قطعاً حرام تھا۔

مولوی حامد رضا: بالکل صحیح۔

سیّد درویش: آپ کو علامہ شبلی صاحب کا یہ کہنا کہ علم کا سرچشمہ اہل بیت علیہم السلام ہی ہیں؛ کسی اُمتی کا اِن سے تقابل کروانا ہی گستاخی اور جاہلانہ خودی سری ہو گی، اچھی طرح یاد ہے۔

مولوی حامد رضا: جی بالکل پروفیسر صاحب نے ابن تیمیہ کی ردّ میں علامہ صاحب کا بلیغ اور مشہور جملہ ہدیہ فرمایا تھا۔ جس میں شک وشُبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سیّد درویش: تو پھر قیاس خواہ اولویت کی صورت میں ہو یا منصوص العلۃ کی، قطعاً جائز نہیں۔

مولوی حامد رضا: کیسے سیّد صاحب؟

سیّد درویش: تفسیر المنار ج8 ص331 اور تفسیر نور الثقلین ج2 ص7 میں صادق محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کا فرمان ہے: ''**من قاس امر الدین برایه قرنه اللّٰہ تعالٰی یوم القیامة بابلیس**'' کہ ''جو شخص اُمورِ دین میں اپنے قیاس کو کام میں لائے گا، اسے خدا بروزِ قیامت ابلیس کے ساتھ ملائے گا''۔

لیجئے! مولوی صاحب آپ کے فنِ قیاس کی Mitosis نے ایک سے دو آدم علیہ السلام بنا دیئے ہیں۔

مولوی حامد رضا: دو آدم؟ وہ کیسے؟

سیّد درویش: ایک وہ جس نے گناہ اوّل کیا۔ دوسرا وہ جس نے ترکِ اولیٰ کیا۔ لیکن میں بتا چکا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد نہیں، بلکہ اصل میں عکس

Isomorphs ہیں۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ ایک دوسرے میں اپنے ہی عکس کو پہچاننے سے انکاری ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ایک کا سیب کھاتا ہے تو دوسرے کا گندم۔ خیر ایک تیسرا آدم علیہ السلام بھی ہے۔

مولوی حامد رضا: تیسرا آدم؟

سیّد درویش: جی ہاں تیسرا آدم!

مولوی حامد رضا: (ہنستے ہیں) وہ کدھر سے آ گیا؟

سیّد درویش: آیا نہیں جناب بلکہ ایجاد کیا گیا ہے۔

مولوی حامد رضا: کس نے ایجاد کیا ہے؟

سیّد درویش: یہ تیسرا نمونہ اشعری فرقے کی ایجاداتی فن کاری ہے۔

مولوی حامد رضا: اُن کا کیا اپنے آدم کے بارے میں کہنا ہے؟

سیّد درویش: اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ نبوت سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گناہانِ کبیرہ کا صادر جائز ہے؛ حتیٰ کہ کفر بھی قبل از نبوت ممکن ہے۔ وہ اس حدیث کو اس زمرے میں بڑے شدومد سے پیش کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہتے تھے: ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہونا تھا''۔ مطلب اسلام لانے سے پہلے بت پرست بھی حکمِ الٰہی سے نبی ہوسکتا ہے۔ اُن کے مطابق بعد از نبوت بھی نبی گناہِ کبیرہ کرے تو اس کی نبوت کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا، کیونکہ جو کرواتا ہے، اللہ ہی کرواتا ہے۔

مولوی حامد رضا: یہ کیسے ممکن یا جائز قرار پا سکتا ہے؟

سیّد درویش: یاد رکھئے کہ یہ صفاتیہ اور جبریہ فرقوں کے فکری وارث تھے۔ خیر ابھی ایک اور چوتھا آدم بھی ہے۔ مطلب آدم کی چوتھی قسم۔ معتزلی آدم۔ معتزلہ گناہ کبیرہ کو بعد از نبوت ناجائز کہتے ہیں۔ لیکن صغیرہ گناہ ہوسکتا ہے۔ ہاں کچھ کہتے ہیں کہ ایسا نبی عمداً کرتا ہے؛ باقی کہتے ہیں سہواً۔ یعنی اشاعری آدم تو جبری آدم ہے، لیکن معتزلی آدم

ایک تفویضی آدم ہے۔

(اس بات پر پروفیسر امیر علی بولے:)

پروفیسر امیر علی: لیکن سیّد صاحب اشاعریہ تو معتزلیہ کی ضد تھے۔ اور آخرالذکر عصمتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قائل ہیں۔

سیّد درویش: جی عصمت کے قائل تو ہیں لیکن مطلقہ کے نہیں۔ دوسرا یہ کہ دونوں مذاہب ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس کی کوئی حقیقت پسِ پردہ نہیں۔ یہ ایک دوسری ہی کلامی بحث چھڑ جائے گی۔ لیکن اتنا اشارہ ضرور دیتا جاؤں گا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ہی اُلٹے عکس ہیں۔ معتزلی تجردیت، رنگین اشعریت کیلئے استدلالی خاکہ ہے، جس میں رنگ بھر دو تو اشعری تصویر بن جائے گی۔

پروفیسر امیر علی: میں نے اس تناول میں اِن دونوں مکاتبِ فکر کا مطالعہ کیا ہے نہ جائزہ لیا ہے۔ البتہ آپ نے جو عقیدہ گناہِ اوّل اور ترک اولیٰ میں مماثلت دریافت کی ہے کہ وہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں؛ اُس کے بعد اشعری اور معتزلی Isomorphism ناممکن نظر نہیں آتی؛ جبکہ آدم علیہ السلام کی چہار اشکال سے اتفاق ناگزیر ثابت ہو جاتا ہے۔ سیّد صاحب اثنا عشریہ میں بھی تو ترک اولیٰ کا نظریہ پایا جاتا ہے۔ آپ نے اُس کا علیحدہ ذکر نہیں کیا۔

سیّد درویش: آپ نے ٹھیک کہا کہ 'پایا جاتا ہے'۔ لیکن یاد رہے کہ 'ہے نہیں'۔

پروفیسر امیر علی: وہ کیا کہتے ہیں کہ Exception Proves the Rule۔ بدقسمتی سے معتزلہ خیالات نے بعض اثناء عشر راہنماؤں کو سیاسی مفاہمت کے حصول میں آگے بڑھنے کیلئے بڑا متاثر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعیت کے مقدمہ ولایت کی جگہ معتزلہ تقصریت کے اثرات نظر آنے لگے۔ چنانچہ مکتب اہل بیت علیہم السلام کے برعکس خود شیخ صدوق بابویہ نے معتزلی 'نظریہ سہوالنبی' کو شیعہ عقائد کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔

چونکہ استدلال میں ادراک ماند پڑ گیا تو معتزلیت مانندِ شعیت نظر آنے لگی۔ شیخ صدوقؒ نے اپنی کتاب ''من لا یحضرہ الفقیہ'' میں عقیدہ سہو النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے مخالفوں کو باقاعدہ غالی اور اہلِ تفویض قرار دیا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ نبی علیہ السلام دین پہنچانے میں تو معصوم ہیں، لیکن دوسرے اُمور میں عام لوگوں کی طرح ہی ہیں اور ان میں اشتباہ کا مکان ہے۔ جدید عصر کے شیعہ مقصرین میں شیخ خالصی اور اُن کے مقلدین وہابی تحریک کے نظریات میں ابن تیمیہ کے کافی نزدیک ہیں۔ زیدی فرقے کی طرح ایرانی مزاج بھی شیعیت کی روح میں ہمیشہ معتزلی نظر آتا ہے؛ جو سیاسی رُجحان صفوی دُور میں باقاعدہ مذہبی نظام کی صورت اختیار کر گیا۔

پروفیسر امیر علی: کیا شیخ صدوق صاحب کے اس عقیدہ کی اہلِ تشیع میں کسی نے ردّ کی؟

سیّد درویش: اُن کے ہی شاگرد شیخ مفید نے شیخ صدوق کے عقیدہ سہو النبی کی تردید میں ایک رسالہ ''عدم سہو النبی'' تحریر کیا۔ جس میں بڑا واضح طور پر لکھا کہ ''شیخ صدوق نے پیغمبرِ اسلام کیلئے سہو ونسیان کا قول اختیار کر کے ایسی زحمت برداشت کی جو ان کے شایانِ شان نہ تھی''۔

(گفتگو کو یکسر مولوی حامد رضا نے یہ کہہ کر اپنی طرف لوٹا لیا)۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب ان آدمِ اربعہ میں حقیقی کون سا ہے؟ اگر نہیں تو حقیقتِ بنی، آدم علیہ السلام میں کیا ہوئی؟

سیّد درویش: معصوم کی نوعیت معصوم ہی جان اور بتا سکتا ہے۔ باقی یہ سب غیر معصوم اور اُمتیوں کی صنعت کاریوں کی پیداوار ہے۔

مولوی حامد رضا: میں چاہتا ہوں کہ سیّد صاحب آپ عقیدہ سہو النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، جو شیخ صدوق نے معتزلی سطور پر مکتب تشیع میں قائم کرنے کی کوشش کی، اُس پر مزید روشنی

ڈالیں۔

سیّد درویش: ایسی مقصرانہ سوچ نے مکتب تشیع میں عصمت الانبیاء علیہم السلام کے سفینہ میں ایک طرف تو ترک اولیٰ کا باریک سا سوراخ کرنے کی کوشش کی ہے؛ دوسری طرف ولایہ مطلقہ کو اجتہاد کی چھینی لگا کر تشریحی اور تکوینی کے دو ٹکڑوں میں جُدا کرنا چاہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ عصمہ اور ولایہ سے انہیں کوئی ذاتی گزند پہنچا ہو۔ یہ معتزلی شیعہ قرآن کی آیت برائے نافرمانیٔ آدم علیہ السلام کی تفسیر وتشریح میں ایسے نازاں ہیں کہ ترک اولیٰ کے لفظ کی رعایت دے کر وہ فلسفۂ عصمت پر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اپنا احسان جتلا رہے ہوں۔ ’’وعصی آدم ربہ فغوی۔ ثم احببہ ربہ فتاب علیہ وھدی‘‘۔ اب نظریہ ترک اولیٰ ایک مچھلی کی مانند ہے۔ احتیاطاً اس اندیشے سے کہ کہیں یہ مچھلی کسی کی سمجھ کے جال میں نہ آ جائے، اہل تقصیر نے دو سوراخ بھی بنائے ہوئے ہیں۔

مولوی حامد رضا: کیسے دو سوراخ؟

سیّد درویش: (ہنس کر) وہی آپ والے دو۔ ایک کا نام حکمِ ارشادی، اور دوسرا حکم مولویت۔ اب اگر خدا ناخواستہ پھر بھی صورتِ حال بے قابو ہونے لگے تو یہ ہماری سمجھ کو ’’نسیان کا ٹیکہ‘‘ لگا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اللہ نے آدم علیہ السلام سے عہد لیا تھا؛ لیکن تقدیرِ الٰہی میں لکھا جا چکا تھا۔ اس تقدیر کو جاری کرنے کیلئے حضرت آدم علیہ السلام پر نسیان طاری کر دیا گیا تاکہ وہ بھول جائیں۔ یعنی اِن کو خود پتہ نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہوتا ہے جو وہ کہہ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان والا کام کرنے پر خدا خود مجبور ہوتا ہے، جو وہ کہہ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان والا کام کرنے پر خدا خود مجبور ہو جاتا ہے کہ اُس کو غفلت میں ڈال دے۔ خدا سے ایک آدم علیہ السلام قابو نہیں ہو پا رہا۔

مولوی حامد رضا: اگر تقصیریت اس حد تک خود اہلِ تشیع میں سرایت کر چکی ہے تو امامیہ عقیدہ عصمت الانبیاء علیہم السلام کا ترجمان، غیر متنازعہ کون ہوگا؟

سیّد درویش: میں اس سے پہلے اشارہ دے چکا ہوں کہ معصوم کی حجت کا خود معصوم ہی قیام کرتا ہے۔ کسی غیر معصوم کی کیا حیثیت ہے؟ کچھوے کیا ہوا میں اُڑا کرتے ہیں؟ تو سنیئے!

خلیفہ وقت، مامون رشید، معتزلی حاکم، ظاہری دوست اور پس پردہ اہل بیت علیہم السلام کے حاسد دشمن کا دربار ہے۔ علی بن محمد جہم کہتا ہے کہ دربار میں علی رضا علیہ السلام بھی موجود تھے۔

مولوی حامد رضا: میں بات کاٹنے کیلئے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن ابن جہم تو خود منکرین آئمہ اطہار علیہم السلام میں سے تھا۔

سیّد درویش: بس سُنتے جائیں۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ خیر، دربار میں مختلف مذاہب و ادیان کے علماء کو مامون نے جمع کیا ہوا تھا۔ امام رضا آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہر ایک کو مناظرے میں لاجواب کرتے جا رہے تھے۔ اس وقت ابن جہم اُٹھا اور بولا: ''فرزندِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کیا آپ انبیاء علیہم السلام کو معصوم جانتے ہیں؟''

امام رضا علیہ السلام: جی ہاں۔

ابن جہم: پھر آپ اس آیت ''وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی'' (طٰہٰ:121) کے متعلق کیا کہتے ہیں؟

(ذرا امام علیہ السلام کے الفاظ سنئے گا! توجہ رہے!)

امام علی رضا علیہ السلام: ''تجھ پر صد افسوس! خدا سے ڈر اور انبیائے کرام کی طرف فحش کلامی مت کر۔ اور اللہ کی کتاب کی تفسیر اپنی رائے سے بیان نہ کر؛ کیونکہ اللہ نے آیاتِ متشابہات کے متعلق فرمایا ہے: ''وَمَا يَعۡلَمُ تَاۡوِيۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ'' (آل عمران:7) ''اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر حجت اور خلیفہ بنایا تھا؛ ان کی تخلیق زمین کیلئے ہی ہوئی تھی۔ انہیں جنت کیلئے تو بنایا ہی نہیں گیا تھا''۔

مولوی حامد رضا: بے شک حقیقتِ آدم علیہ السلام، لسان آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہی جاری ہونا تھی۔

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب یہ مناظرہ میری نظر سے بھی ''عیون اخبارِ الرضا'' میں گزرا ہے۔ لیکن آپ علیہ السلام ہی آگے چل کر کہتے ہیں: ''کہ آدم علیہ السلام سے جو لغزش صادر ہوئی وہ جنت میں ہوئی؛ اگر زمین پر ان سے مذکورہ لغزش صادر ہوتی تو ان کی عصمت پر اعتراض ہوسکتا تھا۔ ان کی عصمت زمین کیلئے ضروری تھی تا کہ وہ امر خدا کے مقررات کی تکمیل کر سکیں''۔

سیّد درویش: میں نے آپ کو آغاز میں ہی بتا دیا تھا کہ مناظرہ مامون معتزلی کے دربار میں تھا۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ کتاب شیخ صدوق کی تحریر ہے۔ لیکن آپ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ امام علیہ السلام نے یہ آیت بھی ساتھ ہی پڑھ ڈالی: ''اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰهِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ O (آل عمران:۳۳) مطلب ''بے شک اللہ نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آل عمران (علیہم السلام) کو عالمین پر منتخب کرلیا ہے''۔

کیا آپ غور کر چکے کلامِ امام علیہ السلام پر کہ کس قدر حکیمانہ طور پر، بنا خبر ہوئے، معتزلی دربار میں بیٹھ کے نظریہ تخطیہ الانبیاء، قبل از بعثت و تخلیق کے چیتھڑے اُڑا دیئے ہیں!

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب میری سمجھ میں تو کوئی ایسی سوچ نہیں آئی۔

سیّد درویش: اللہ تخلیق سے پہلے جب وقت کیلئے کوئی مکاں ہی نہ تھا، عالمِ ازل میں ہی نبی علیہ السلام، انبیاء علیہم السلام کو منتخب کر لیتا ہے۔

مولوی حامد رضا: جی بالکل ایسا ہی ہے۔

سیّد درویش: اچھا! تو یہ بتاؤ پھر خطاء کیلئے وقت کی گنجائش کہاں سے پیدا کر لاؤ

گے؟

مولوی حامد رضا: کمال ہے۔

سیّد درویش: رسول زادے علیہ السلام نے اُس ملعون ابن جہم کو چھوڑا نہیں جو کہنے لگا کہ پھر اس آیت کے متعلق بھی فرما دیں: ''وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا'' (یوسف: 24) (ترجمہ:) ''اور اُس (زلیخا) نے اُن سے بُرائی کا ارادہ کر لیا تھا اور وہ یوسف بھی ارادہ کر بیٹھے''۔

امام آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں مخاطب کیا: ''زلیخا و یوسف دونوں کے ارادے مختلف تھے۔ زلیخا نے یوسف علیہ السلام سے جنسی تسکین کا ارادہ کر لیا تھا، جبکہ یوسف علیہ السلام نے فیصلہ کر لیا کہ اگر اُس نے معصیت پر زیادہ مجبور کیا تو وہ اسے قتل کر دیں گے۔ اور اللہ نے یوسف سے قتل کی بُرائی اور زلیخا سے زنا کا ارادہ دور رکھا۔ چنانچہ اللہ فرماتا ہے: ''كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ'' (یوسف:24) ''اس طرح ہم ان سے بُرائی اور بے حیائی کو دُور کرنا چاہتے تھے''۔ یہاں بُرائی سے مراد قتل اور فاحشہ سے مراد زنا ہے۔

(یہ سننا تھا کہ مولوی حامد رضا بولے:)

مولوی حامد رضا: یوں لگتا ہے جیسے میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ پھر ایک ایسا زلزلہ آیا کہ ساری عمارت میں شگاف دوڑ گیا۔ اب اپنے پرانے عقیدے میں میری موجودگی غیر محفوظ اور غیر مطمئن ہو کر رہ گئی ہے۔ میں نے جس مضمون کے عنوان سے بحث کا آغاز کیا؛ اُس پر میری برملا تنقید، فقط نافہمی کی بناء پر تھی۔ لیکن اگر خدا کی رحمت شاملِ حال ہو، نیت بد نہ ہو: تو غلطیاں ہی ہماری حق کے پوشیدہ راہ پر شعوری طور سے گامزن ہونے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

سیّد درویش: ہم غیر معصوم علم کسب کرنے والوں کی حقیقت یہ ہے کہ آتے بھی

جاہل ہیں اور بوڑھے ہو کر قبر میں جاتے بھی جاہل ہیں۔ یہ تو درمیان کا عرصہ ہماری زندگی کا طالب علمی کا زمانہ ہوتا ہے۔

مولوی حامد رضا: سچ تو یہ ہے کہ عصمتِ آدم علیہ السلام پر یہ دلیل میں نے کسی علامہ یا عالم سے سنی، نہ پڑھی، اور نہ ہی خود اس زاویے پر غور کیا۔

سیّد درویش: مولوی صاحب! آپ ان علماءِ سُو کی بات کر رہے ہیں۔ اِن سے تو ہم انبیاء علیہم السلام کی عصمت بچانے میں لگے ہوئے ہیں۔ کیا پیدی اور کیا پیدی کا شوربہ۔ عالم ہونا تو دُور، یہ تو عصمت الانبیاء علیہم السلام کو سمجھنے تک کی طالبانہ اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ ہم بتا چکے کہ پیدائشی کیا، نبی علیہ السلام قبل از تخلیق عالم الارواح میں بھی نبی علیہ السلام ہی ہوتا ہے۔ یہ سوفسطائی عالم ایسے ہیں کہ شہد، ان کو ہضم نہیں ہوتی اور دعویٰ کرتے ہیں خود شہد کی مکھی ہونے کا۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب عصمتِ آدم علیہ السلام کو سمجھنے میں ہمیں کہاں پر دھوکہ ہوتا ہے؟

سیّد درویش: سورۃ طٰہٰ: 117,115 کی آیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام علی رضا علیہ السلام نے واضح کر دیا کہ ہم اس بنیادی نقطے کو جب سمجھنا ہی نہیں چاہتے کہ آدم علیہ السلام تو جنت میں رہائش کیلئے تخلیق کیا ہی نہ گیا تھا، تو سوچ کی ساری عمارت ٹیڑھی ہی کھڑی ہوگی۔

دوسری طرف جب رجیم بنا کر ابلیس کو نکال دیا گیا تو حکمتِ الٰہی کو سورۃ حجر:39 میں اپنی مات دیکھ کر چلّا اُٹھا کہ ''رَبِّ بِمَآ اَغۡوَیۡتَنِیۡ'' (ترجمہ:) ''مالک نے تو مجھے بہکا دیا''۔

اب ذرا دو آیات سنئے: ''**وَلَقَدۡ عَهِدۡنَآ اِلٰٓی اٰدَمَ مِنۡ قَبۡلُ فَنَسِیَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا**'' یعنی ''ہم نے آدم علیہ السلام سے پہلے پہل عہد لے لیا تھا، لیکن وہ اسے بھول گیا

اور ہم نے اس میں عزم و استقامت نہ پایا''۔ دوسری آیت: ''فَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ ھٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ وَلِزَوْجِکَ فَلَا یُخْرِجَنَّکُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰی'' ترجمہ یوں ہوگا کہ ''ہم نے کہا اے آدم! یہ تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے باہر نکلوا دے کیونکہ اس طرح تو تم زحمت اور مشقت میں پڑ جاؤ گے''۔

دیکھیں سارا خاکہ امام علی رضا علیہ السلام آیات کے اشاروں میں اہلِ عقل و ادراک کو دے چکے۔ اچھا کوئی مجھے یہ بتائے کہ پہلی آیت میں آدمؑ نے عہد توڑ دیا تو یہ وہ کون سا عہد تھا؟ دوسری آیت میں کہتا ہے کہ اے آدم علیہ السلام! تمہیں کیا سر درد ہے کہ شیطان کے پیچھے لگ کر اپنا سکون غارت کرو۔ ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کرتے چلیں کہ اللہ یہ سب باتیں آدم علیہ السلام کو پہلے ہی بتا رہا تھا: جبکہ دوسری طرف ابلیس کی شیطانیت کو بھی متواتر اُکسایا جا رہا ہے۔ آگے آیت: 119 میں اللہ آدم علیہ السلام کو سہولت و چین کی ترغیب بھی دے رہا ہے کہ مت جنت چھوڑ کر جاؤ کیونکہ ''وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَلَا تَضْحٰی'' یعنی ''نہ تو اس میں پیاسا رہے گا اور نہ ہی سورج کی تپتی ہوئی دھوپ تجھے تکلیف پہنچائے گی''۔

کیا آپ نے غور کیا کہ ساری یہ آدم علیہ السلام سے گفتگو اُس کی تخلیق سے قبل کے عالم میں ہو رہی ہے۔ ابھی مٹی کے پُتلے کا نام ونشان نہیں۔ خلیفہ زمین پر آنے سے پہلے ہی مقرر ہو چکا۔ جو آئندہ پتہ چلے گا۔

مولوی حامد رضا: آخر کیا مقصدِ الٰہی پوشیدہ تھا؟ یہ ہلکی ہلکی مدھم کرنیں کس حکمت، کس مصلحت کی مخبر ہیں؟

سیّد درویش: تخلیقِ آدم علیہ السلام، حکمِ سجدہ سے پہلے ہی خدا کو معلوم تھا کہ یہ عابد سجدہ نہ کرے گا۔ اللہ نے دوسری طرف آدم علیہ السلام کو مکافاتِ عمل سے کھل کر آگاہ کر دیا کہ وہ (آدم علیہ السلام) اپنے ارادے میں آزاد ہے۔ وہ بااختیار اور ذمہ دار

ہے۔ اب ابلیس اس پیش گفتار سے برابر خبردار ہے۔ اچھی طرح جانتا تھا۔ اسی کو کہتے ہیں کہ اصل میں احمق وہ ہوتا ہے جو جانتے ہوئے بھی نہ جانتا ہو۔ اُس کا جاننا ہی جہلیت کہلاتی ہے۔ اس کی جان کاری نے ناگاہ جہالت کو منطقی جہلیت میں بدل ڈالا۔

ذرا آگے سنئے گا آیت: 121 میں آدم علیہ السلام نے: ''**وعصیٰ آدم ربه فغوی**''، یعنی رب کی حکم عدولی کر دی۔ پھر ہونا کیا تھا، دونوں کو اُس جنت سے شیطان نے نکلوا دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام مکہ کی سرزمین صفا پر بطور صفوۃ اللہ اُتر آئے، اور حوا، جو عورت مرأۃ تھی، وہ مروہ پر! اچھا آپ نے کبھی اس آیت میں لفظ ''غوٰی'' پر تحقیق فرمائی ہے؟

مولوی حامد رضا: ''غوٰی'' مشتق ہے، ''غی'' کے مادہ سے۔ جو ایسے جاہلانہ کام کے معنی میں ہے کہ جس کا سرچشمہ عقیدہ ہو۔ کچھ نے ''غوٰی'' کو اس جُہل و نادانی کے معنی میں بھی لیا ہے کہ جو غفلت سے پیدا ہو۔ بہرحال ''غی'' لفظ مقابل ہے ''رُشد'' کا۔ رُشد یہ ہے کہ انسان کسی ایسے راستے سے جائے کہ اپنے مقصد تک پہنچ جائے۔ لیکن ''غی'' یہ ہے کہ اپنے مقصود کو حاصل نہ کر پائے۔ پس لفظ ''عصیاں'' کا مطلب ہے اطاعت و فرمان سے باہر ہو جانا، چاہے وہ فرمان وجوبی ہو یا استحبابی۔ لہٰذا لفظ عصیاں سے لازمی طور پر ترکِ واجب یا ارتکابِ حرام کا معنی مراد نہیں بلکہ ایک مستحب کا ترک یا مکروہ کا ارتکاب ہوسکتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو ترک اولیٰ کے عنوان سے مشہور ہے۔ یعنی گناہِ نسبتی۔ مطلب جو گناہ نہ ہو، نہ ہی مقامِ عصمت کے خلاف۔ یوں کہہ لیں کہ ''**حسنات الابرار سیئات المقربین**'' یعنی نیک لوگوں کی اچھائیاں مقربین کیلئے گناہ ہوتی ہیں۔

سیّد درویش: مولوی صاحب کیا سارا جھگڑا یہ نہ تھا کہ آدم علیہ السلام کو کیوں اللہ نے اپنی طرف سے خلیفہ فی الارض بنایا؟

مولوی حامد رضا: جی بالکل!

سیّد درویش: کیا منشائے الٰہی پورا نہ ہو گیا؛ آدم علیہ السلام اپنے مقصد کو پہنچ نہ گیا؟

مولوی حامد رضا: بے شک آدم علیہ السلام بن گیا، جو بننا تھا۔

سیّد درویش: لیکن آپ نے خود ہی بتایا کہ ''غی'' لفظ مقابل ہے ''رُشد'' کا۔ رُشد یہ ہے کہ انسان کسی ایسے راستے سے جائے کہ اپنے مقصد تک پہنچ جائے۔ لیکن ''غی'' یہ ہے کہ اپنے مقصود کو حاصل نہ کر پائے۔

تو جس کی خلافت کا ضامن؛ جس کو اللہ خود اپنا خلیفہ، راشد خلیفہ مقرر کر چکا ہو، وہ رُشد کے راستے پر گامزن جب زمین پر آ پہنچا، تو ''غی'' کے کیا معنی رہ گئے؟

مولوی صاحب نے جواب نہ دیا۔

سیّد درویش: اب آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ ایسا کوئی عہد ہوا ہو اللہ اور آدم علیہ السلام کے درمیان، کہ آدم علیہ السلام نے جنت سے نہیں نکلنا؟

مولوی حامد رضا: عہد کا مجھے علم نہیں، البتہ منع ضرور کیا تھا کہ ''شجرِ ممنوعہ'' کے قریب مت جانا۔

سیّد درویش: اللہ کی حکمتِ عملی کچھ سمجھ آئی؟ بس سارا کمال عہد نہ لینے اور ساتھ ہی شجر کے پاس جانے کی ممانعت کے درمیان ''خالی جگہ'' میں ہے۔ عقل کیلئے ادراک کا مرکز یہ غیر مرئی نقطہ (Unseen Spot) ہے۔ مطلب ابلیس مصلحتِ الٰہی کی یہ چال سمجھ ہی نہ سکا کہ جنت سے اخراج کا عہد تو لیا نہیں، لیکن شجر ممنوع کر دیا۔ وہ سطور کے مابین لکھی عبارت پڑھنے کے اہل ہی نہ تھا۔ کیونکہ عبارت والوں کیلئے ممکن ہی نہیں کہ آیات کے اشاروں کو جان پائیں۔ اس کیلئے قلب چاہیے، جو اُس کے پاس تھا نہیں۔

مولوی حامد رضا: وہ حکمتِ عملی کیا تھی؟ سیّد صاحب ذرا تفصیل سے بتائیں۔

سیّد درویش: خدا کو اندازہ نہیں، بخوبی آگاہ تھا کہ یہ احمق، ابلیس اپنی خود اثباتی کیلئے حالتِ انکار(State of Denial) میں اندھا دُھند چلا جائے گا۔ اب ذاتِ باری تعالیٰ نے حکمتِ عملی یہ اختیار فرمائی کہ آدم کو دانستہ طور پر کہہ دیا کہ وہ گندم یا پھل نہ کھائے۔ ابلیس دوسری طرف ضد میں وہی کروانے پر تُل گیا، تاکہ ثابت کردے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام جیسے نالائق شخص کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے خود اپنی ہی ناانصافی اور جہالت کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ ابلیس حقیقت میں وہیں آ پھنسا جہاں حکمتِ الٰہی اُسے لانا چاہ رہی تھی۔ ابلیس اپنا جال خود بُن رہا تھا آدم علیہ السلام کو ورغلانے میں۔ اب یہ بدماغ نفسیاتی مریض، آدم علیہ السلام کو پھسلا کر اُسے غفلت میں سُلا کے نافرمان ثابت کر کے جنت سے باہر نکلوانے کے احمقانہ پروگرام پر عمل پیرا ہو گیا۔ وہ یہ سمجھنے سے ہی بالکل قاصر و معذور تھا کہ وہ قہراً اللہ ہی کے مقصد کو آدم علیہ السلام کے زمین پر لانے میں برآور کر رہا ہے۔ اور جب آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجا جا چکا؛ جبکہ یہ خود نکال پھینکا گیا؛ تو اسے ہوش آئی کہ وہ اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مار چکا تھا۔ ثابت معلوم ہو گیا کہ غافل آدم علیہ السلام نہ تھا؛ غفلت میں خود ابلیس تھا۔ اب آپ سمجھے کہ شیطان زمین پر آ کر کیوں چلّایا کہ ''اُسے تو دھوکہ ہو گیا''۔ سچ ہی کہتے ہیں کہ دیوتاؤں نے جب کسی کو برباد کرنا ہوتا ہے تو اُس کا دماغ خراب کر دیتے ہیں۔ اب اُس کو اُلٹا ہی بالکل سیدھا دکھائی دے گا۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب یہ دیوتا کیسے دماغ خراب کرتے ہیں؟

سیّد درویش: آپ نے یونانی المیہ نگار (Sophocles) کا کھیل Ajax اگر پڑھا ہو، تو اُس میں ہوا یہ کہ اجاگس نے حسد میں آ کر بھیڑوں کو جرنیلوں کے گمان میں قتل کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ عقل کی دیوی Athena نے اُس کی عقل پر حجاب ڈال دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ Achilles کی ڈھال اُس کو ملے، جو Odysseus کو عطا کر

دی گئی۔ لیکن جب اُس کو ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ وہ بے شک اندھا فریب خوردہ تھا۔ اُس کی خود اثباتی ذہنی یرقان میں حماقت کا شکار ہو گئی۔

اسی لیے اسلام میں کسی خود اثباتی کا تصور نہیں۔ یہ نظریہ خودی، رُوحِ اسلام کے منافی ہے۔ یہ غیر اسلامی فلسفہ، نظریہ خودی، خود مسلمان مفکرین کی ایجاد ہے، جس کا حقیقی اسلام سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ انسان کی نفسیاتی ایجاد، اصل میں نتیجہ ہے، جب غور وفکر عقل کی جگہ قیاس کو اپنا راہبر چُن لیتی ہے۔ عقل دریافت کرتی ہے؛ قیاس بناوٹی ہوتا ہے۔ عقل کا خدا اور ہے۔ قیاس کا خدا اور ہے۔ عقل کا حق اور ہے؛ قیاس کا حق اور ہے۔ یہ عقل اور قیاس؛ خدا اور نفس؛ حق اور باطل کے درمیان کشمکش کا سلسلہ نہ صرف ایک معروضی، بلکہ موضوعی حقیقت بھی رکھتا ہے۔

مولوی حامد رضا: کیا یہ خود اثباتی، جس میں قیاس کارفرما ہے، کا نظریہ عجمی تصوف، رہبانیت اور ویدانت کے راستے داخل اسلام نہ ہوا، جس نے آہستہ آہستہ اسلامی فکر کی جڑیں تباہ کر دیں؟

سیّد درویش: (ہنستے ہیں) آپ کہنا چاہتے ہیں کہ شیطان عجمی تھا۔

مولوی حامد رضا: میں نے یہ تو نہیں کہا۔ (کچھ گھبرا گئے، سیّد درویش کی بات پر)

سیّد درویش: مجھے لگا کہ آپ کا مطلب تھا شیطان عجمی تھا اور آدم علیہ السلام عربی۔ کس قدر طفلانہ سوچ اور متعصب الزام ہے۔ یہ سوچنا کہ اسلام میں سارا بگاڑ ایرانی، یونانی، ہندی اور سریانی علوم وافکار کا کیا کرتا ہے، جہلیت کی خودی کو تشفی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کوئی ان جعلی اسلامی مفکروں سے پوچھے کہ کبھی علوم اور علم سے بھی عقلی و روحانی بگاڑ پیدا ہوا ہے؟ کیا غیر اسلامی کتب وعلوم میں اتنی ہی طاقت تھی کہ قرآن کی حاصل کردہ تعلیم بھی اُس بیرونی زہر کا سدِّ باب کرنے کے قابل نہ ثابت ہو سکی؟

مولوی حامد رضا: مسلمان مفکرین وعلماء کا کہنا ہے کہ ابھی تک تعلیمِ قرآن پوری

طرح اُمت میں راسخ نہ ہو پائی تھی کہ بیرونی افکار و خیالات نے اسلام پر یلغار کر دی۔

سیّد درویش: کس نے یلغار کیا؟ انتظار کر لیتے! تاریخ فتوحات کا تجزیہ تو دیانتدارانہ کیجئے۔ کیا ضرورت تھی بیرونی حملوں میں بے صبری کی؟ اُمت کی تعلیم و تربیت مکمل ہو جانے تک صبر کر لیتے۔ کیا باہر نکلنے سے پہلے گھر میں کوئی باقاعدہ اس سلسلے میں نظام و ادارے قائم کیے گئے تھے جن کو یک دم بیرونی علوم نے زنگ آلود کر کے ناکارہ بنا دیا؟

مجھے تو ایسے تعلیمی اداروں یا باقاعدہ علمی نظامِ تربیت، بلکہ سیاسی نظام و حکومت کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی علم نہیں۔ صرف اندرونی اور بیرونی جنگوں کی فوری تاریخ شروع ہو جاتی ہے۔ اِدھر زکوٰۃ کی وصولی پر خانہ جنگی شروع ہوئی؛ ساتھ ہی بیرونی فتوحات کی سرگرمیوں میں سارا منظر بدل گیا۔ ہر طرف اللہ کے نام پر الجہاد اور جنت کے ایمان افروز نعرے گونج رہے تھے۔ اس سپارٹا کی طرز کے نظام Spartan System میں توقع کرنا کہ ایتھنز (Athens) کا علمی اور فکری معاشرہ قائم ہوگا، آپ کو ممکن معلوم ہوتا ہے؟

مولوی حامد رضا: یہ دو الگ سمتیں، الگ راستے تھے۔

سیّد درویش: 23 سال قرآن پاک اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، پاک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ آنحضرت کے بعد 50 سال گزر گئے۔ اتنے لمبے عرصے کی تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا۔ سنئیے گا! اجرِ رسالت یہ دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے (علیہ السلام)، گھر والوں اور رفقاء کو بھوکے، پیاسے، کربلا کے ریگستان میں دِن دہاڑے ذبح کر دیا۔ کیا تعلیم کا یہ اثر سقراط اور بقراط؛ ارشمیدس اور گیلن؛ بُدھ اور مانی مت سے کلمہ گو، قرآن خواں علماء اور حفاظ نے لیا تھا؟ نہیں جناب، آپ بات کو سمجھ نہیں رہے۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو فرمایا تھا کہ ''حصولِ علم میں چین بھی چلے جاؤ''۔ یونان کیا، چین تو ایران اور ہند کے بھی

پار، بُدھ کے مندروں کی سرزمین تھی۔ ایرانی یا یونانی یا مصری علوم کی بات نہیں، علم تو چین کے مندروں میں بھی ہو تو حاصل کرو۔ پھر یہ علوم خود نہیں آ گئے، بلکہ خود مسلمان لے کر آئے۔ باب العلم علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سنہری الفاظ ہیں کہ: ''علم مؤمن کی گمشدہ متاع ہے، اُسے یہ علم حاصل کرنا ہے خواہ وہ کافر کے سینے میں ہی کیوں نہ پوشیدہ ہو''۔ جب نفسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، حکیم منبر سلونی حضرت علی علیہ السلام سے اسکندریہ کے کتب خانے کی بابت وہاں موجود یونانی، مصری اور لاطینی کتابوں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعلق پوچھا تو فرمانے لگے: ''ان کتب کو مت تباہ و برباد کرو کیونکہ یہ قرآن کے منافی نہیں بلکہ اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس کی ہی تشریح کرتی ہیں''۔

علم کسی مخصوص علاقے یا زمانے تک اسیر نہیں ہو جاتا۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتا ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی جواب دینا ہو گا کہ اگر عجمی علوم اتنے ہی مُضری تھے تو فتوحات کا دروازہ کھول کر کیوں دشمن کو گھر میں داخل ہونے دیا؟ اگر مجبوری بن گئی تھی تو مزید ارضی پھیلاؤ روک دیا ہوتا۔

قرآن میں تعقل اور غور و فکر کو تقویٰ و نیکی سے الگ نہیں کیا گیا! انسان کا خاصہ جو اُس کو حیوانیات میں ممیز کرتا ہے، وہ عقل ہی تو ہے۔ بیرونی علوم نے تو صرف Stimulus دیا۔ اس چیلنج کو قرآن کی روشنی میں احسن دلیل، حکمت و نصائح کے بلند ترین اُصولوں کے مطابق حل کرنا مقصود تھا نہ کہ مسترد۔ ماحصل گفتگو یہ ہے کہ فساد کی جڑ یہ ابلیسی نظریہ خودی ہے۔ ابلیس کا گناہ، تکبر اور اُس کا اپنی ''انا'' کو مستحکم، استحکام بخشنا تھا۔ یہ خودی مسلمانوں نے اگر دنیا میں عظمت اور طاقت حاصل کرنے کیلئے مفید اور عزیز جانی ہے تو اس کا اسلامی حکمت و فلسفہ سے کوئی دُور دُور تک واسطہ نہیں۔ یہ خودی کا اسلام میں خلافتِ الٰہی کے نام پر سلطنت سازی کرنا ایسا ہی ہے جیسے عیسائیت نے کلیسا سازی کر کے رومن سلطنت کو مذہبی جواز بخشا۔ جب خودی، خود ہی حجت بن جائے گی؛ جو کہ یہ

ہے ہی نہیں؛ تو پھر اصلاح، عظمت اور نیکی کے نام پر چارلس ڈارون کا قانونِ بقا ہی اخلاقیات اور شعورِ انسانیت کی بے لحاظ موت ثابت ہوگا۔ یہ وہی جرمن فاسٹ کی ''میں'' ہے؛ خود اثباتی کی روح، جو اپنی ازلی حقیقت کو خوش فہمی کے لذیذ فریب میں بلند کر کے اللہ کے برابر لا کر اُس کو یہ پوچھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بقول شاعرمشرق سر محمد اقبال سیالکوٹی: ع

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا خود بندے سے پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(فلسفہ خودی اور ڈاکٹر علی شریعتی، پروفیسر امیر علی کا پسندیدہ مطالعہ تھا۔ وہ بولے:)

پروفیسر امیر علی: مفکر انقلابِ ایران، ڈاکٹر علی شریعتی نے بھی تو علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کو سراہا ہے۔

سیّد درویش: شہید معلم انقلابِ ایران، علی شریعتی کے فلسفہ ''نہی'' کا سر اقبال والی ''خودی'' سے کوئی منطقی تعلق واسطہ نہیں۔ کسی کی لفظی ہنرمندی کا مداح ہونا الگ بات ہے۔ ایک انسان بہت سارے لکھاریوں کے اسلوب و الفاظ کا پرستار ہوسکتا ہے؛ لیکن ایں ہرگز مطلب نیست کہ وہ اُن کے خیالات سے ضروری مطابقت بھی رکھے۔ اور نہ ہی علی شریعتی، سر اقبال پر کوئی تحقیق کر رہے تھے۔

علی شریعتی تو فلسفہ شہادہ کا داعی تھا جو ''لا'' سے شروع ہوتا ہے۔ اُس کا ہیرو ''ابوذر'' کسی خود اثباتی کے شوق میں مبتلا کوئی صوفی درویش، کوئی نہ ہاتھ میں تلوار لیے پرچم کشائیں کرنے کے حق میں تھا۔ بلکہ وہ حق کی شہادہ؛ عدل کی تلاش میں؛ ظلم کے خلاف ربذہ کے صحرا میں نڈھال، بے بس، شہر بدر، سراپا احتجاج کرتے کرتے اپنی خودی کو قربان کر دیتا ہے۔ عملی زندگی میں علی شریعتی نے کوئی ''سر'' کا خطاب حاصل نہیں کیا بلکہ مغرب اور امریکہ کے خلاف شعورِ علوی کو جہاد اور شہادہ پر آمادہ کیا۔ علی شریعتی کا امام

علیہ السلام، نہج البلاغہ کے اپنے ایک خطبے ''قاصعہ'' میں تکبر، خود پسندی اور خودی کی سربلندی کی مذمت میں یوں فرماتا ہے: ''عبرت حاصل کرو اُس بات سے جو اللہ نے ابلیس کے بارے میں کی۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے کہ خدا کسی انسان کو اس عمل کے ساتھ جنت عطا کرے، جس کی وجہ سے ایک فرشتے کو جنت سے باہر نکال دیا۔ اللہ کا حکم اہلِ آسمان و اہلِ زمین کیلئے ایک سا ہی ہے''۔

میرا خیال ہے کہ یہاں ہمارا مسئلہ وہ والا بھی ابتدائی بحث میں حل ہو گیا کہ اگر گندم یا سیب وہاں ناجائز ہوتے تو یہاں کبھی نعمت شمار نہ کیے جاتے۔ دوسرا اگر ہم اپنے اہلِ کتاب بھائیوں والا عقیدہ درست جان لیں تو ہوگا یہ کہ تمام خواجہ سرا پیدائشی ولی اللہ جنم لیں گے۔ اس لیے نعمتِ اوّل کو گناہِ اوّل کہہ کر کفرانِ نعمت کر کے عذابِ الٰہی مول لینے سے قطعاً پرہیز کرنی چاہیے۔

پروفیسر امیر علی: مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ آپ نے اس جملے میں ڈاکٹر علی شریعتی کے فلسفۂ شہادہ اور ترکِ اولیٰ میں نہایت لطیف گرہ لگائی ہے۔ فلسفہ خودی کی اس نفی کو آپ اُجاگر کر کے ہمارے خیالات پر غلط فہمیوں اور مغالطوں کے اَبر کو صاف فرمائیں۔

سیّد درویش: آپ نے اس تعلق کا بڑا عمیق اندازہ لگایا ہے۔ دیکھیں تعلیم دینے کے دو طریقے ہی ہوتے ہیں: (i) عملی (ii) لفظی۔ آدم علیہ السلام اپنے کردار سے یہ تعلیم دے رہا ہے کہ ''انا'' پرستی، ''انا'' اثباتی مت کرو؛ کیونکہ آخر میں یہ ظلمتِ نفسی ہی ثابت ہو کر ابلیس بنا کے تمہیں رجیم کی طرح رحمتِ الٰہی کی اُمید کے دائرے سے باہر پھینک مارے گا۔ اس کے بجائے خلیفہ بن کر اللہ کی طرف سے زمین پر رجوع کرو، جو ممکن ہی نہیں جب تک تمہارا نفس اپنی قربانی دے کر جنت کی لذتوں اور آسودگیوں کو ترک نہیں کر دیتا۔ قربانی کا مقصد کیا ہوتا ہے؛ یہ ہی کہ حق کی گواہی دینا۔ یہ گواہی علی شریعتی کا

فلسفۂ اسلامی، شہادہ کہلاتا ہے۔

پس آپ جس گہرے تعلق کو محسوس کر رہے تھے وہ یہ ''ترک الذت'' کی حکمت ہے جس کو سامنے لانے کیلیئے میں ڈاکٹر علی شریعتی کے فلسفۂ شہادہ کو بروئے کار لایا۔

یہ سن کر پروفیسر صاحب مسکرا کر ہلکا سا سر کو ''ہاں'' میں ہلاتے ہوئے خاموش ہو گئے۔

تھوڑے سے وقفے بعد مولوی حامد رضا نے اپنی گفتگو کا سلسلہ دوبارہ قائم کرلیا۔

مولوی حامد رضا: آپ نے بڑے باہنر طور پر ''نظریہ ترک اولیٰ'' کو ''حکمتِ ترک الذت'' میں فلسفۂ شہادہ کی روشنی میں بدل دیا ہے۔ بالکل جیسے گناہِ اوّل کو نعمتِ اوّل ثابت کیا۔ بے شک ترک الذت کی حکمت اُس وقت تک سمجھ آ ہی نہیں سکتی جب تک ابلیسی نظریہ خود اثباتی کو فلسفۂ شہادہ ردّ نہ کر دے۔ آج تک میں اس ہی منحوس مغالطے میں مبتلا تھا کہ آدم علیہ السلام کو شیطان نے دھوکہ دے دیا۔ حالانکہ وہ تو خود ذہنی فریب و قیاس میں مبتلا اور شکار تھا۔

سیّد درویش: انا پرستی میں ڈوبا، جو آدم علیہ السلام کو ترک اولیٰ میں نافرمان ثابت کرنے کے چکروں میں اللہ کے عدل کی بلندیوں کو چیلنج کر رہا تھا؛ اُس کی دماغی حالت یہ تھی کہ وہ جنت جس میں آدم علیہ السلام رہائشی تھا، اُس کی مادی نوعیت کو بھی سمجھنے کے لائق نہ تھا کہ آیا وہ دائمی تھی یا عارضی۔

مولوی حامد رضا: اکثر پڑھے لکھے حضرت کا ماننا ہے کہ یہ بس تمثیلی باغ تھا۔

سیّد درویش: جب سوچ ہی مفروضاتی ہو تو ہر حقیقت تمثیلاتی چشمے سے ہی دیکھی جاتی اور نظر آتی ہے۔ یہ ہی Pyrrhonism ہے۔ قصہ مشہور ہے کہ جب وہ سڑک پر چلتا تو کہتا، سامنے آنے والا چھکڑا، چھکڑا نہیں ہے۔ تو آیئے بجائے خیالی لڑائیوں میں اُلجھ کر وقت برباد کریں، سیدھا معصوم آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھتے ہیں، کیونکہ ہم کون سا

وہاں موجود تھے۔ چنانچہ امام جعفر علیہ السلام کا کہنا ہے کہ ''وہ جنت دنیا کے باغوں میں سے ایک باغ تھا، جس میں سورج اور چاند طلوع ہوتے تھے۔ آخرت کی دائمی جنت میں شیطان داخل نہیں ہوسکے گا''۔ یعنی ایسی مادی جنت تھی جہاں سورج کی روشنی اذیت انگیز نہ تھی۔ تو جس احمق کو اپنے گردونواح کی نوعیت سے آگہی نہ ہو اُس سے یہ توقع ہوسکتی تھی کہ وہ اپنی فکری توانائیاں درست سمت میں بھی صرف کرے گا؟

پس وہ مادے کی حقیقت سے بے شعور تھا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ وہ مادے اور عقل میں حقیقت شناسی کے رشتے کو سمجھنے سے قطعاً قاصر تھا۔ وہ قیاس پرست احمق، مٹی پر آگ کے افضل ہونے کو جتلا رہا تھا۔ حالانکہ علم کا تو اُس سے کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔ یعنی اُس میں سوال کو سمجھنے کی اہلیت تک نہ تھی۔ مٹی کو سجدہ کرنے کا تو اللہ نے کہا ہی نہ تھا۔ اللہ نے بتایا تھا کہ جب وہ مٹی کے پتلے میں ''الروح'' پھونک دے گا تو اُس وقت سجدہ ریز ہونا۔ سجدہ تو آدم علیہ السلام کے مقامِ علم وعقل کو تھا۔ آدم علیہ السلا کو قبل از تخلیق معرفت عطا کر دی گئی تھی؛ علم اُس نے کسب نہیں کیا تھا۔

لیکن یہ فریب خور، ابوالقیاس، مادے کو ہی حقیقت سمجھتا تھا۔ یہ ہی ابلیسی حقیقتِ علم، نرگسیت ہے جس میں خودی ہر چیز کو اپنے قیاس میں دیکھتی ہے۔ یہ ہی وہ ابلسیت ہے جو ہمیں اٹلی کی انسان پسند نشاۃ ثانیہ اور مارٹن لوتھر کی اصلاحی تحریک میں ملتی اور انسانیت وحریت کے نام پر تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ ہے فیشٹے اور نیٹشے، ''اسرارِ خودی'' کے پیچھے، جسے فلسفہ وحکمت کے اسلامی ہار پہنائے جاتے ہیں۔ یہ عالمی جنگیں اور دہشت گردیاں؛ اقتصادیاتی، نفسیاتی اور تعلیمی اضطراب و عذاب، سماج اور اخلاقیات میں؛ سب منطقی نتائج اُسی ابلیسی ڈرانے کا انت Denouement ہے۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ابلیس کٹر مؤحد تھا۔

سیّد درویش: جذباتیت پر مبنی ایسی سوچ Romanticism سے زیادہ کچھ

نہیں۔ یہ نظریہ صوفی حلقوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے اُس غیر سنجیدہ اور سرسری رویے کا جو یہ لوگ حکمتِ آدم علیہ السلام کے مطالعہ میں برتتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ مؤحد ہوتا تو کہتا کہ ''تُو نے اے رب مجھے گمراہ کر دیا ہے؟'' وہ آدم کی آڑ میں اللہ کا ہی تو مُنکر تھا۔

مولوی حامد رضا: وہ کیسے؟ تاہم یہ بات کچھ پلے پڑتی ہے کہ اُس نے یہ کیوں کہا کہ اے رب تُو نے مجھے گمراہ کر دیا ہے۔

سیّد درویش: شیطان میں آپ کو بتا چکا کہ آدم علیہ السلام کو نافرمان ثابت کر کے اللہ کو ظالم، جاہل اور الوہیت کے ہی نااہل قرار دینا چاہتا تھا۔ اصل میں ترکِ اولیٰ کا نظریہ اللہ کے ظالم ہونے سے عبارت ہے۔ یہ کہنا کہ ابلیس آدم علیہ السلام کے اللہ کو اپنا رب مانتا تھا ایک عام اور خام خیال اور مغالطے سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ ابلیس کا اللہ خود اُس کا اپنا بنایا ہوا، خود ساختہ اللہ تھا؛ جو اُس نے قیاس سے گھڑ گھڑ کر بنا رکھا تھا۔ ابلیس کا اللہ موضوعی نرگسیت کا، اُس کے نام میں عکس تھا، جس کو اُس کی خودی اپنے قیاس کے من پسند آئینے میں دیکھا کرتی تھی۔ چنانچہ جب ابلیس نے کہا کہ ''تُو نے مجھے دھوکہ دیا ہے''، تو گویا وہ بتا رہا تھا، الزام لگا رہا تھا، کہ وہ نہ صرف رب ہونے کے دعویٰ میں ظالم، نااہل اور جاہل ہے، بلکہ دھوکے باز بھی ہے۔ اسی لیے شیطان نے معافی بالکل نہیں مانگی! اور مانگتا بھی کیوں؟ وہ اُس کا اللہ تھا ہی نہیں۔ اللہ تو اُس کیلئے نام تھا۔ اُس نام میں وہ خود اپنے حق ہونے کے گرد گھومتا تھا، جس کا نام اُس نے عبادت رکھا تھا۔ ابلیس کی عبادت پس خودی کے گرد طواف کرنا تھا۔ اُس نے قیامت تک مہلت مانگ کر یہ ثابت کیا کہ وہ آدم علیہ السلام کے اللہ کے متقابل شطرنج کا حریف کھلاڑی تھا۔ یہ تو ابلیس کو بعد میں سمجھ، ہوش آئی کہ وہ آدم علیہ السلام کو، نہ ہی آدم علیہ السلام کے اللہ کو نااہل کھلاڑی ثابت کر سکا۔ اُس نے اللہ کو کب عادل اور لائق عبادت کہا؟ کبھی نہیں۔ اللہ کو اُس نے گمراہ کن اپنا دشمن قرار دے دیا۔ معلوم ہوا کہ ترک اولیٰ کا مطلب ہے کہ اللہ نے نااہل

کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے اپنے علم، عدل اور خلق میں خود کے ناقص ہونے کا ثبوت پیش کیا اور ابلیس پر ظلم ہوا۔

مولوی حامد رضا: لوگوں کا یہ کہنا کہ خودسر ابلیس پکا مؤحد تھا، اس طرح ''ترک الذت'' کے فلسفۂ شہادہ سے ناآشنائی ظاہر کرتا ہے۔ آپ ''ترک الذت'' کی حکمتِ شہادہ پر مزید روشنی ڈالیں۔

سیّد درویش: میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ مجھے ترک اولیٰ کے اس نظریے میں عیسائیوں کے عقیدے گناہِ اوّل کی بدبو آتی ہے۔ حالانکہ وہ نسلِ انسانی اور رُشد و ہدایت کے پاسداران کی بابت نعمتِ اوّل The Original Blessing ہے۔ اب میں ابوالائمہ علیہ السلام کا قول سنانے لگا ہوں: ''اللہ نے فرات کے میٹھے پانی سے ایک چُلّو بھرا اور اُس کو اپنے ہاتھوں پر خشک کیا اور وہ جم گیا۔ اللہ نے فرمایا میں اپنے انبیاء علیہم السلام اور مرسلین اور نیک بندوں اور ہدایت یافتہ آئمہ علیہم السلام اور لوگوں کو جنت کی طرف دعوت دینے والوں کو اور ان کی اتباع کرنے والوں کو قیامت تک تجھ سے ہی خلق کروں گا''۔

آپ نے سورۃ طٰہٰ کی آیات میں دیکھا کہ آدم علیہ السلام نے کس طرح امن و امان والی جگہ، جو اپنے آرام دِہ ہونے کی وجہ سے جنت تھی؛ اس کو چھوڑ کر رنج و الم اور صحرا مکہ میں سکونت اختیار کر لی۔ آدم علیہ السلام نے لذت، آرام اور عیش و بےفکری کی زندگی چھوڑ دی۔ کیا لفظی تفصیل اور اُن کے مادوں میں گھسے بغیر بھی آدم علیہ السلام کا عمل، اُس کا لذت سے کنارہ کشی اختیار کرنا سمجھدار طالب علم کیلئے کافی تعلیم نہیں؟ اب عملِ آدم علیہ السلام ایک ہی ہے۔ حقیقت میں ایک ہی کام ہوا تھا کہ آدم علیہ السلام نے جنت چھوڑ دی یا چھوڑنا پڑی۔ لیکن ایک سوچ کہتی ہے کہ اُس نے گناہ کیا؛ اُس نے ترک اولیٰ کیا؛ وہ گناہِ اوّل کا مرتکب ہوا۔ دوسرا نقطہ نظر کہتا ہے کہ نہیں اُس نے صاف

صاف ترک الذت کو اختیار کیا اور نعمتِ اوّل کے پیشِ نظر اپنے شجرے میں حسد کے خلاف خود کو تکلیف میں ڈال کر زمین پر آ گیا تا کہ شجرے طیبہ کی شجر کاری کی ذمہ داری، امانت لوٹا سکے۔ اب ابلیس ملعون خود ہی بول اُٹھا: ''تُو نے رب مجھے گمراہ کر دیا''۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ کل تک دوسروں کو گمراہ کرنے والا؛ آدم علیہ السلام کے ترک اولیٰ کا داعی؛ آدم علیہ السلام کے ترک الذت کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ قہراً تسلیم کر گیا کہ اُس کے قیاس کو مات ہوگئی۔ لیکن ابلیس ہوتا ہی وہ ہے جو جان جائے لیکن بات کو سمجھے نہیں۔

آدم علیہ السلام اگر عیش پرست، آرام طلب ہوتا تو اللہ اسے خلیفہ فی الارض بناتا ہی کیوں؟ اللہ نے تو قبل از تخلیق آدم علیہ السلام کو عالمِ ارواح میں تنبیہ فرما دی تھی کہ خلافت کے عوض اُسے بڑے غم اُٹھانے ہوں گے۔ آدم علیہ السلام کو اہتمامِ حجت کیلئے اللہ نے جنت میں ہی مقیم رہنے کو کہا۔ ایک طرف اللہ آدم علیہ السلام کے جذبہ ایثار و قربانی پر زور دے رہا ہے؛ تو دوسری طرف ابلیس اس فلسفہ قربانی کو گناہ اور ترک اولیٰ ثابت کرنے کی خود فریبی میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ آدم علیہ السلام کے پاس تو کھلی اجازت تھی کہ وہ ازخود انتخاب کرے آرام یا تکلیف کو۔ یہ تو Epicurean Choice کے خلاف آدم علیہ السلام کی Stoic Nature کو سامنے آنا تھا۔

لیکن قلب ہی کے اندھے، کیا کریں؛ بجائے یہ کہ آدم علیہ السلام کی بلند نظری اور شرف کو دیکھتے ہوئے اُسے روحانی ہیرو تسلیم کریں؛ اُلٹا ترک اولیٰ اور گناہ کا الزام چسپاں کرنے میں ذرا شرم اور ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے؛ بلکہ اپنی سمجھ پر فخر فرماتے ہیں۔

مولوی حامد رضا: نہایت حیرت انگیز مقامِ افسوس ہے، جو لوگ آدم علیہ السلام کی ترک الذت کے رواقی فلسفہ کو اُلٹا نفس پر ظلم کہتے ہیں۔

سیّد درویش: جو ایسا کرتے ہیں، وہ بالکل ٹھیک ہیں۔

مولوی حامد رضا: آپ نے خود ہی تو سیّد صاحب، آدم علیہ السلام کے ترک الذت میں رواقیت کا مقدمہ شہادہ نفس پیش کیا ہے۔تو پھر یہ کیسے آپ کی نظر میں صحیح ہو سکتا ہے؟

سیّد درویش: آپ کا کیا خیال ہے کہ کچھوا اُڑ کر درخت کی شاخ پر بیٹھ جائے؟ آپ چاہتے ہیں کہ Cyrenaics سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ Senecaاور Epictetus کی پیروی اور مطالعہ کریں۔ اُنہیں کون سمجھائے کہ آدم علیہ السلام نے اپنے نفس پر موسیٰ علیہ السلام کی طرح ظلم یہ کیا کہ خود کو اذیت میں ڈال کر مقامِ خلافت پر پورا اُترے، جسے ''فی الارض'' کہتے ہیں۔ خالی زمین پر خلیفہ نہ بن کر آیا؛ بلکہ زمین پر بطور خلیفہ اعلیٰ معیارِ توحید کو پورا کیا۔ یہ Stoic Sense of Self-sacrifice اُن کیلئے واقعاً ترک اولیٰ ہی ہونا چاہیے جو سقراط، سینکا، عیسیٰ علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کے ترک الذت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

مولوی حامد رضا: کیا ایسے حضرات ''نافرمانی'' لفظ کے ظاہری مفہوم سے دھوکہ کھا جاتے ہیں؟

سیّد درویش: جی ایسا بالکل نہیں! بلکہ ہمیں لفظ کے پیچھے گھات میں بیٹھی ''خودی'' پر نظر رکھنی چاہیے۔ اس ظاہری دھوکے کے پیچھے باقاعدہ خود فریبی کارفرما ہوتی ہے۔ ابلیس نے کیا کیا؟ اُس نے حقیقی معنی کو سمجھنے کی بجائے حقیقت کو مادی جسم تک محدود جانا۔ وہ الفاظ کی نسبت میں جوہری حرکت کو سمجھنے سے قطعاً قاصر تھا۔

لفظ کیا ہوتا ہے، جسم؛ اور اس کا استدلال سے تعلق ہوتا ہے۔ لفظ کی رُوح کیا ہے، معنی؛ جو ادراک کیلئے ہی ممکن ثابت ہوتا ہے۔ مقصر ابلیس کیلئے اللہ کا لفظ اُس کی خودی میں اپنی جوہری حرکت سے محروم، ایک مُردہ، بنا رُوح، فقط جسم تھا۔ اُس کی خودی لفظ میں اپنے اعلیٰ ہونے کو آگ کی مٹی پر فوقیت سے باہر تصور ہی نہیں کرسکتی تھی۔ اس کی

خودی کا معیار، اچھائی کو اپنے استحکام و ثبت کے علاوہ شہادہ و قربانی کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اُس کے قیاس میں خودی کے باہر معروضی حقیقت کا وجود نہ تھا۔ ساری دنیا اُس کیلئے بشپ برکلے کی طرح موضوعی تھی۔ یہ قیاس ہے ہی Selfhood In Extrapolation۔ خودی کا اپنے آپ کو ہی باہر دیکھنا، دوسری دنیا میں Extrapolate کرنا ہے۔

مولوی حامد رضا: حضرت مریم علیہا السلام کو قرآن نے کہا، طاہرہ ہے۔ حضرت فاطمہ علیہا السلام کو آیت نے کہا تطہیراً ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آدم علیہ السلام کیلئے آیات میں ایسے الفاظ استعمال ہی کیوں کیے جن میں ترک اولیٰ کا شبہ و گمان گزرے؟ مثلاً، ''آدم علیہ السلام نے عہد کو بُھلا دیا اور ہم نے اُس میں عزم نہ پایا''۔ پھر یہ کہنا کہ ''آدم علیہ السلام نے حکمِ ربی کو نظر انداز کر دیا''۔ میرا مطلب ہے کہ عصمت پر اعتراض کا منہ اللہ نے انبیاء علیہم السلام کیلئے صریحاً بند کیوں نہیں کیا؟

سیّد درویش: تاکہ انسان کے اندر ابلسیت کی نرگسی مرضِ خودی کو عیاں کرنے میں کوئی حجت باقی نہ رہ جائے!

اللہ اِن آیات میں انسان کے نفس کی روحانی زندگی میں ہونے والی جوہری حرکتِ عقلیہ کو الگ کر کے دکھا دیتا ہے کہ نفس میں Spiritual Transformation ہے یا کہ External Extrapolation۔ جس کی بہترین مثال ہمیں ہیگل کی کتاب ''مظہریاتِ روح'' میں ملتی ہے۔

مولوی حامد رضا: آپ کیا جوہری حرکت کو رُوح میں عقلی تغیر سے تدبیر کرتے ہیں؟

سیّد درویش: بے شک جوہری حرکت الفاظ تک محدود نہیں، بلکہ نفوس کی نسبت اور ایمان کے ساتھ ساتھ حقیقتِ اشیاء کو بھی معنوی طور پر بدل کر رکھ دیتی ہے۔ امام

حسین علیہ السلام کی قرآن فہمی کی چہار منازل سے یہ ہی مراد تھی۔ مثلاً حجرا سود کیا ہے؟ کالا پتھر۔ بس؟ نہیں! مکے کے کفار بھی اس کو ہی پوجتے تھے۔ پتھر کو گھڑ کر ہندو بھی لاکھ سمجھانے کے باوجود شرک کرتے آ رہے ہیں۔ لیکن اس کالے پتھر کو دینِ ابراہیمی اور خدائے واحد کے مذہب اسلام میں ایک خاص مقام عطا کیا گیا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ پتھر اُس نسبت کو ظاہر کرتا ہے جو شرک سے نہیں بلکہ توحید سے ہے۔ اچھا کعبہ کیا ہے؟ اینٹوں کی عمارت کعب نما۔ یہی ہے نا؟ وہاں کیا اللہ رہتا ہے؟ اللہ تو کسی مکاں و زماں میں محدود نہیں ہوسکتا۔ لیکن بات عمارت کی نہیں، نسبت کی ہے۔ اچھا! کیوں عیدالضحیٰ کو قربانی دیتے ہو؟ گوشت تو ہر کوئی مسلمان استعداد کے لحاظ سے کھاتا ہے۔ کیا گوشت کھانے سے ثواب ملتا ہے؟ نہیں! ثواب لیکن ضرور ملتا ہے، جب اسماعیل علیہ السلام کی یاد میں ابراہیم علیہ السلام کی نسبت سے قربانی کرتے ہو۔ تو جوہری حرکت میں بیج کی نسبت، اصل، درخت اور پھل میں سامنے آ گئی۔ اسی طرح اصحابِ کہف کا وفادار کتا قابلِ احترام ہے قرآن میں اُن صالحین کی نسبت!

مولوی حامد رضا: یعنی ہر شے کی نسبت میں جوہری حرکت، لفظ سے لے کر عقل تک، پتھر سے لے کر حیات کے وجود تک، حکمتِ الٰہی کا اسرار ہے۔

سیّد درویش: جی ہاں؛ یہ ہی جوہری حرکت عقل کیلئے عبارت کو آیت کے اشاروں میں بدلتی ہے۔ آپ حکمتِ الٰہی کا انداز تو دیکھیں۔ قیاس اور عقل میں تمیز روا رکھنے کی کسوٹی تو دیکھیں۔ اللہ نے وحیٔ الٰہی میں اعتراض کا باب کھولا ہی اس خاطر ہے کہ کسی کو اپنے ابلیسی اجتہاد میں مقصر ہونے پر کوئی شک نہ رہ جائے، نبی ﷺ کی عصمتِ مطلقہ کا انکار کرنے کے بعد۔ بعض آیات، کون کون سی پتہ نہیں، متشابہات بنا کر تم پر فرض کر دیا کہ جاؤ اور راسخون فی العلم کو تلاش کرو، جو کہ تم خود نہیں ہو۔ اب تم آزاد ہو کہ آیاتِ قرآنی میں عصمتِ آدم کو تلاش کرنے والا ترک الذت کا رواقی عقیدہ

Stoic Doctrine دریافت کرو، یا اس کے برعکس وہ ابلیسی نظریہ ترک اولیٰ جو اصل میں Epicurean Doctrine، اپیقوری عقیدہ ہے۔ یوں ہمیں خود اپنے آپ کو عصمت کی آیات میں دریافت کرنا ہے کہ ہم خود کون ہیں؟ صدیقین کے ساتھ ہیں یا ابلیسی کا ذہین کے۔ ہمیں عقلی اختیار حاصل ہے کہ خود اپنے لیے فیصلہ کریں کہ آدم علیہ السلام کو زمین پر ترکِ لذت میں ایثار وقربانی کے انعام میں خلیفہ مقرر کر کے بھیجا گیا تھا یا پھر ترکِ اولیٰ کے جرم کی سزا میں پرومیتھس کی طرح زمین کی طرف نکال دیا۔ آدم علیہ السلام مسجود ملائکہ تھا یا رجیم کا شریکِ جُرم؟

اللہ تخلیق سے قبل ہی خلافتِ الٰہیہ کا اعلان کر چکا تھا۔ ''**انی جاعل فی الارض خلیفة**'' پس تنزیل اپنے ظاہری الفاظ میں عصمتِ آدم علیہ السلام کے منافی اس لیے معلوم ہوتی ہے کہ تاویلِ آیات کی جائے، جو الفاظ کو آیات کے اشاروں میں بدل کر باطنی معنوں کی حقیقت کے ابواب کھول دے، تا کہ آیات میں نفس کے ساتھ جوہری حرکت پیدا ہو۔ لیکن جب جُہلا، جن کے دلوں پر تعصب کی مہریں لگی ہیں، راسخون فی العلم کے بُغض وحسد میں، آیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُن کی آنکھوں پر خود اثباتی کے کثیف پردے گر جایا کرتے ہیں۔ اُن آنکھوں والے نابینوں کو خلیفہ فی الارض اور رجیم ابلیس میں تمیز ہی ختم ہو جاتی ہے۔ پس اللہ نے عصمتِ آدم علیہ السلام کی آیات میں جُہلا اور عُقلا کے مابین ایک فیصلہ کن خط کشید کر دیا ہے آدم علیہ السلام کے کردار میں۔ یہ ہی نبوت کا مقصدِ آدم علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کی انسانیت کو عملی تعلیم ہے۔

یہ کہنے کے بعد سیّد صاحب بے اختیار ہنسنے لگے۔ جب پوچھا کہ ایسا کیا خیال تھا جس نے آپ کو یوں تڑپا دیا، تو کہنے لگے: ''ترک اولیٰ کے ابلیسی عقیدے کے بھی کیا کہنے!'' پوچھا: اس کا یہاں کیا معاملہ ہوا؟ بولے: ''میں سوچ رہا ہوں کہ اگر خلیل جبران کی حکایت والا ''شیطان'' ہوتا تو وہ کہتا کہ میرے نیک اور تیز دھار مقصر یارو؛ تم نے

ترک اولیٰ والی کیا منطق گھڑی ہے! اُس کا تو مجھے اَتا پتہ نہ تھا۔ تم انسان تو مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے ہو۔ مجھے تو تم نے بدنام کر رکھا ہے، ورنہ اصل اُستاد تو تم خود ہی ہو، بھلا تم جیسوں کو کون پڑھائے!

تینوں ہنسنے لگے۔

قہوہ پینے کے بعد سبھی تازہ دَم ہو گئے۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب بولے:

پروفیسر امیر علی: اگرچہ ہماری بحث اپنے احسن انجام پر منطقاً اختتام پذیر ہو چکی ہے؛ لیکن اپنی نظریاتی اصلاح کیلئے چند سوالات ابھی بھی تشنہ ہیں۔ کئی پڑھے لکھے حضرات کا ماننا ہے کہ آدم علیہ السلام کوئی حقیقی شخص نہ تھا؛ بلکہ اُس کو ''حضرت'' کہہ کر عمومی طور پر انسان کو مخاطب کیا ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کا وجود تمثیلی ہے۔ حضرت کا لفظ فقط حرفِ تنکیر ہے۔ اور وہ اس طرح The Man کہلوایا جاتا ہے۔

سیّد درویش: دیکھیں آدم علیہ السلام کی نوع اپنی بشری جنسیت میں انسانی نہیں بلکہ نبوتی ہے۔ انسان وہ ہے جو علم کسب کرے؛ نبی علیہ السلام وہ ہے جو علم دے۔ انسان علم حاصل کرتا ہے؛ نبی علیہ السلام کو عطا ہوتا ہے۔ دوسرا آپ نے یہ تو واضح ہی نہیں کیا کہ یہ حرفِ تنکیر جو Article ہے، اُس کی حیثیت عمومی یا خصوصی ہے؟

پروفیسر امیر علی: بے شک یہ عمومی حرفِ تنکیر ہے۔ ہم کوئی بھی مخصوص کریں، تو مراد تمام بنی نوع انسان ہی ہوں گے۔

سیّد درویش: یہاں بنی نوع انسان کیلئے عمومی حرفِ تنکیر نہیں؛ بلکہ بنی نوع انسان کی جنسیت میں خاص نوع کو عقل کیلئے واسطے ہدایت مخصوص کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ نبی علیہ السلام کی نوع کو بشر کی جنس میں مخصوص کر رہا ہے۔ میں نے سورۃ آل عمران: 33 از زبانِ معصوم بتا دیا کہ ''بے شک اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران (علیہم السلام) کو ان عالمین پر منتخب کر لیا ہے''۔ تو اللہ حضرت ''The'' کا سابقہ لگا کر

بتا رہا ہے کہ ''وہ'' آدم علیہ السلام ''جو'' بشر کی صورت میں نبی ﷺ بھیجا گیا۔ آدم کو بشراً نوع سمجھنے والی سوچ کا ہی تو ابلیس کو سجدہ کرنے سے روک دیا۔ پس میرے اس جملے میں ''جو'' کا ''وہ'' کی طرف اشارہ کرنا ہی The ہے۔ جملہ یوں ہوگا کہ یہ، وہ ہے جس کو نبی علیہ السلام بھیجا انسان میں متشکل کر کے!

پروفیسر امیر علی: آپ اس ''وہ'' کو آدم علیہ السلام میں جس طرح حقیقی نبی علیہ السلام بیان کریں گے، اس کی عام فہم مثال کس طرح دی جا سکتی ہے؟

سیّد درویش: ایک ہوتی ہے اصل، کسی بھی شے کی اصل؛ دوسری ہوتی ہے نقل، جو اصل کے مانند ہو۔ مثلاً مصر کے بادشاہ کو فرعون کہتے تھے۔ جیسے ایرانی بادشاہوں کو کسریٰ، حبشہ کے نجاشی اور روم کے قیصر کہلاتے تھے۔ تاریخ میں کم و بیش 125 فرعون گزرے ہیں۔ اب اہلِ کتاب اور ہم مسلمان جب بھی فرعون کا ذکر کرتے ہیں تو موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا فرعون ہی ذہن میں اُبھرتا ہے۔ حالانکہ نبی یوسف علیہ السلام کے دور میں بھی 430 سال قبل از موسیٰ علیہ السلام، فرعون تھا۔ اب فرعون کئی، لیکن موسوی فرعون مخصوص ہو گیا۔ قرآن میں فرعون کی تیسری قسم بھی مراد نکالی جا سکتی ہے۔ جس کو ہم مجازی کہیں گے، یعنی فرعون کی مانند، لیکن حقیقی فرعون نہیں۔ یہ فرعون نما اپنی صفات میں اُس سے مماثلت رکھنے کی وجہ سے فرعون ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ''انسان بن، فرعون نہ بن''۔ یعنی فرعونیت کی خاص صفت کی وجہ سے کوئی بھی انسان فرعون کہلا سکتا ہے۔ پس مجازی فرعون ہونے سے حقیقی فرعون غیر حقیقت نہیں ہو جاتا۔ بلکہ یہ مجازی تو فرعونیت کی عالمگیر صفت کو حقیقی موسیٰ علیہ السلام والے فرعون کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ یہ حقیقی کی طرف لوٹانا کسی لفظ یا صفاتِ مخصوصہ کی تاویل کہلاتا ہے۔ پس فرعون تمثیلی نہیں؛ بلکہ اپنی حقیقت میں ''مثالی'' ہے۔ بالکل ایسے ہی آدم علیہ السلام بھی اپنی شخصی حقیقت میں مثالی کردار ہے؛ جو اپنی تعلیم و تبلیغ میں عملی انداز اختیار کیے ہوئے ہے؛ نہ کہ تمثیلی۔

آیاتِ قرآنی کا کسی شاعری یا تمثیل سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام دیکھ لیں اپنے صبر میں مثالی کردار تھے۔ ابن عربی کی شہرۂ آفاق تصنیف ''فصوص الحکم'' میں ہر نبی علیہ السلام کو اُس کی ذاتی صفت میں مثالی ہونا، اُس کا جوہر، اُس کی حقیقت قرار دیا ہے۔ یہ کسی بھی نبی علیہ السلام کا اُس کی ذاتی صفت میں مثالی ہونا، اُس کا جوہر، اُس کی حقیقت ہے۔ تو آدم علیہ السلام کا جوہر، انسان کو معرفت کی حکمت سے رُوح شناس کرواتے ہوئے، خود کو درسِ شہادہ دینا مقصود تھا۔ یہ ہی کام سقراط کرتا تھا، تو کیا سقراط اپنے مثالی کردار میں تمثیل بن جائے گا؟

اگر اسی طرح آدم علیہ السلام کو تمثیلی ہو کر غیر حقیقی ہو جانا ہے تو حضرت نوح، ابراہیم اور آل عمران علیہم السلام سبھی اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ زمین و آسمان؛ میں اور ہم؛ خالق اور مخلوق؛ آہستہ آہستہ یہ تمثیل کا اندھیرا نیست و نابود کرتا ہضم کر جائے گا۔ کیونکہ اس تمثیل کا منطقی انجام Nihilism پر ہی ہونا تھا۔ کچھ سمجھ آئی Pyrrhonism کس طرح عقل میں قیاسی دیمک کی طرح موجود ہوتا ہے۔

پروفیسر امیر علی: کیا آدم علیہ السلام اپنی شخصی حقیقت میں بطور ایک فرد محدود نہ ہو جائے گا؟

سیّد درویش: آپ کیوں مثالی کو زبردستی تمثیلی بنائے بیٹھے ہیں؟ کیوں زندہ اور جیتی جاگتی حقیقی مثالوں کو منفی، مجرد تمثیلوں کے لفظی چکروں میں ضائع کرنا چاہتے ہیں؟ یہ معتزلی بھنور ہے۔ کیا فرعونیت، حقیقی فرعون کے حوالے سے محدود ہوتی ہے یا مخصوص؟ کیا رحمت کا عالمگیر تصور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رحمت للعالمین ہونے میں محدود ہوتا ہے یا مخصوص؟ کیا رحمت کا عالمگیر ہونا مشروط ہے، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو تمثیل میں مجرد کرنے سے؟ کیا مکے میں جنم لینے اور مدینے میں زندگی بسر کرنے والے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حقیقی حوالہ ختم کرنا ضروری ہے، کیا یہ رکاوٹ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عالمگیر ہونے میں؟ اس طرح

تو علی علیہ السلام اور ذوالفقار، حسین علیہ السلام اور کربلا بھی مثال کی بجائے تمثیل میں نیست ہو گئے۔ تو اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی اور حسین علیہما السلام، مکہ، مدینہ، کربلا، حقیقت میں مثالی ہیں تو پھر کیا درسِ انسانیت کیلئے حضرت آدم علیہ السلام کو تمثیل کی مشین سے گزار کر مجرداتی طور پر پیش کرنا کیا جائز اندازِ فکر رہ جاتا ہے؟

اگر آپ کی تمثیل ہی حقیقت بن گئی، تو حقیقت کہاں ملے گی؟ قرآن کی آیات ساری کی ساری آخر کار متشبہات میں بدل جائیں گی۔ کسی کے محکم ہونے پر یقین باقی نہیں رہنا۔ اس طرح سارا قرآن علمِ رجال کی تمثیلی کتاب بن جائے گا۔

پروفیسر امیر علی: اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہدایتِ انسانی کیلئے اللہ نے آدم علیہ السلام کو ہماری طرح کا حقیقی انسان بنا کر بھیجا۔

سیّد درویش: اگرچہ یہ بات حرفِ تنکیر کی بحث میں طے پا چکی، لیکن یہاں پھر وہی بات کہوں گا کہ آدم علیہ السلام انسان تھا، ایسا انسان جس کی حقیقت نبوتی تھی۔ سوال آدم علیہ السلام حقیقی کا نہیں، بلکہ حقیقتِ آدم علیہ السلام اصل سوال ہے۔ تو آدم علیہ السلام کی حقیقتِ نوع، بشریت میں جنسی ہے۔ ورنہ اگر آدم علیہ السلام بھی ہم جیسا انسان تھا تو ہر انسان نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیوں نہیں ہو جاتا؟ کیا درس دینے کیلئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی نوع میں بشر ہونا ضروری ہے؟ مثلاً جونہی اسد کا ذکر آیا تو کس چیز کا تصور پیدا ہوتا ہے؟ وہ کس صفت کا درس دیتا ہے؟

پروفیسر امیر علی: شجاعت کا۔

سیّد درویش: کیا اسد کیلئے اس شجاعت کی تعلیم دینے واسطے ضروری ہے کہ وہ اپنی فطرت چھوڑ کر انسان بن جائے؟

پروفیسر امیر علی: اس میں انسان بننا تو خواہ مخواہ، بلکہ بے معنی بات ہے۔

سیّد درویش: اب میں آپ کے سامنے تصور کا متضاد رُخ رکھ کر پوچھتا ہوں کہ

قومِ لوط میں اللہ نے جو فرشتے رسول بنا کر بھیجے، اُن کا مقصد کیا تھا؟

پروفیسر امیر علی: بستی کو تباہ کرنا آئندہ انسانیت کیلئے درس دینا۔

سیّد درویش: جن کو تباہ کیا وہ قوم تمثیلی تھی؟

پروفیسر امیر علی: بالکل نہیں۔

سیّد درویش: فرشتے کیا حقیقتاً انسان بن گئے؟

پروفیسر امیر علی: انسانی صورت میں بھی فرشتے ہی رہ کر اُنہوں نے درس وعبرت دی۔

سیّد درویش: اس طرح آدم علیہ السلام جو بشری صورت میں آئندہ درسِ انسانیت کے پیغمبر علیہ السلام تھے، اُنہیں بھی بشریت کی تمثیل تک محدود کرنے کی ضرورت نہیں۔

پروفیسر امیر علی: پھر حرفِ تنکیر کے ذریعے یہ ایسے ثابت کرنے کی کیوں کوشش میں رہتے ہیں، حالانکہ آل عمران:33 میں واضح بھی کر دیا گیا ہے؟

سیّد درویش: کیوں کہ ان کی طرح آدم علیہ السلام نے جنت میں نہ علم کسب کیا، نہ کوئی پوجا پاٹ کی۔ انہوں نے اپنے اس ناکام قیاس کا نام تمثیل رکھا ہے جو نوعِ انبیاء علیہم السلام میں مختص علم لدنی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ حالانکہ اللہ جو خود سرچشمہ وحی اور خیر مطلق ہے، ہدایت کیلئے انسان صورت میں تو متشکل نہیں۔ مانند مخلوق نہیں۔

پروفیسر امیر علی: جی بالکل۔

سیّد درویش: اللہ نے تو گائے، ہاتھی، چیونٹی، پتھر وغیرہ کو سورتیں بنا کر ہدایت فرمائی ہے۔ تو اگر یہ بغیر اپنی فطرت کی تبدیلی کے ہدایت ثابت ہیں، تو معلمِ انسانیت کیلئے انسانی شکل میں ظاہر ہو کر بھی اپنی نوع کو قائم رکھنا کیوں ممکن نہیں؟ یہ شکل ظاہری کا بدلنا، نہ بدلنا تو ایک ہی سکے کے منفی اور مثبت پہلوؤں کی طرح ہونا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ مثالی کو مثالی ہی رہنے دیں۔ تمثیل بنانے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ اصل سوال یہ ہے ہی نہیں کہ آدم علیہ السلام حقیقی تھا یا تمثیلی۔ بلکہ یہ قرار پاتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی حقیقتِ نوع کیا ہے؟ جوہرِ آدم علیہ السلام کیا ہے؟ آدم کی آدمیت کیا ہے؟ ہم اُلٹا آدم کی حقیقتِ جنس پر بحث کر کے اپنا عقلی ستیاناس کر بیٹھتے ہیں، جواز روحِ قرآن اور اسلامی روایات، بحث بنتی ہی نہیں۔

پروفیسر امیر علی: ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ لفظ ''حضرت'' علاماتی احترام کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جو آدم علیہ السلام کی حقیقت میں نبی علیہ السلام کی طرف بشری صورت میں اشارہ کرتا ہے۔

سیّد درویش: آپ نے سابقے کو ٹھیک سمجھا۔ اچھا ہم جب اشارہ کرتے ہیں تو کیا مطلب ہے؟

پروفیسر امیر علی: کہ اشارے کے پیچھے کوئی چیز ہے، کون ہے، یا کوئی ہے!

سیّد درویش: یعنی کانٹ کی طرح کہ مظہر کے پیچھے ''Noumenon'' ہوتا ہے۔

پروفیسر امیر علی: جی صحیح فرمایا۔

سیّد درویش: اچھا اگر وہاں کوئی ہو ہی نہ تو پھر؟

پروفیسر امیر علی: اگر نقطہ ہی نہیں تو حوالہ کیسا؟ اشارہ لایعنی ہو جائے گا۔

سیّد درویش: آپ دیکھ رہے ہیں کہ اشارہ تمثیل نہیں، بلکہ نقطے کی طرف لوٹا رہا ہے۔ آیاتِ قرآنی اشارہ ہیں؛ تمثیل نہیں۔ اب اگر آدم علیہ السلام شخصی علامت نہ ہوتا، ''حضرت'' ہونے میں تو اللہ سورۃ آلِ عمران:33 والی آیت میں اُس کا ذکر نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام اور آلِ عمران کے ساتھ ملا کر کیوں کرتا؟ ورنہ سارے اِن انبیاء علیہم السلام کا تاریخی انکار بھی کرنا ہوگا۔

پروفیسر امیر علی: میں تو آج تک اشارے اور تمثیل کو ایک ہی جانتا تھا۔

سیّد درویش: بڑا نازک، نفیس اور بنیادی فرق ہے۔ تمثیل کی تشریح ہوتی ہے؛ لیکن علامت کی صرف تاویل۔ قصہ آدم وحوا کو کہنا کہ جی یہ تشبیہ، مجاز اور کنایہ ہے: اُن لوگوں کا شیوہ ہے جو افکارِ مغرب کے متاثرین اور عقل کے مریض ہیں۔ یہ Allegory کو Symbolism قرار دینا اُس ہی سطحی سوچ کا شیوہ ہے جو Scientism کو Science سمجھے بیٹھی ہے۔

عرصہ دراز پہلے میں نے کسی مقامی اخبار میں پڑھا کہ ''انسان چاند پر اُترا ہی نہیں''، کیونکہ وہاں جھنڈا لہرا رہا تھا، جبکہ چاند پر تو ہوا ہوتی نہیں''۔ اب کمال کی بات یہ ہے کہ اس وقت امریکی خلائی حریف، پورے کا پورا ''سوویت یونین'' جو اعتراض نہ کر سکا وہ اُردو اخبار کے دفتر والوں کو نظر آ گیا، وہ بھی بیٹھے بیٹھے، اور اُن کو جن کو دن کے وقت آسمان میں کبوتر نظر نہیں آتا۔ یہ لفظ ''حضرت'' بھی آدم علیہ السلام کے ساتھ ان تمثیلی دانشمندوں کو امریکہ کا خلائی جھنڈا ہی نظر آتا ہے۔ ایسے معاملات میں حالانکہ عقلی تنقید کو باقاعدہ تحقیق درکار ہوتی ہے، نہ کہ نکتہ چینی۔ یہ تنقید برائے تنقید، جس میں کوئی حقیقت نہیں، پیشاب میں مچھلیاں پکڑنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ادرا کی بصیرت تو ہوتی نہیں کہ اصل کو اُصولی طور پر سمجھ پائیں؛ جسے لسانِ حکمت میں چشمِ دل کہتے ہیں۔ البتہ استدلالی بصارت کو ہی علم کے گمان میں میعارِ حق ضرور بنا بیٹھتے ہیں۔ آدم علیہ السلام اپنے عمل و کردار میں انسانیت کو ترکِ لذت کر کے تہذیبِ نفس کا درس دے رہا ہے۔ لیکن کیا عجیب وغریب اجرِ تعلیم ہے کہ طالب علم اُستادِ اوّل کو ہی تمثیل کی بھٹی میں دھکا دے کر، اُس کی مجرد راکھ کی ''مصری مومی'' بنا کے ''کتابِ نیست'' میں بند کر دے۔ اصل میں اِن کو اُجرتِ رسالت دینے کے عادی ہی نہیں۔ اور ان کی یہ ساری تجریدی بحث ایک لایعنی ذہنی عیاشی یا بد دماغی کے سوا کچھ نہیں۔

لامتناہیت کے اس نہ ختم ہونے والے سراب میں آوارہ گردی، مطلب Cerebral activity کی بجائے ضرورت ہے کہ چیز کی حقیقت کو حقیقی کی تاویل میں Symbolize کیا جائے۔ اس کیلئے اہم ترین مواد اور روشنی کا پتہ ہمیں Henry Corbin اور Swedenberg کے ساتھ ساتھ قدیم اسماعیلی مکتبِ فکر میں زیرک مطالعہ کیلئے ملتا ہے۔

پروفیسر امیر علی: حضرت علی علیہ السلام نے حکمت و فلسفہ کی اتھاہ گہرائیوں سے عقلِ انسانی کیلئے جو یہ کہا کہ ''آدم علیہ السلام سے پہلے بھی آدم علیہ السلام تھا۔ اُس سے پہلے بھی ایک اور آدم۔ جو سلسلہ ختم نہ ہونے والا ہے'' کو آپ کس طرح سمجھتے ہیں؟

سیّد درویش: ابوالآئمہ علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو تخلیق تک محدود مت جانو۔ تخلیق سے پہلے بھی آدم علیہ السلام تھا! کیا عالمِ ارواح میں کوئی وقت ہے؟ نہیں!! یہ زماں و مکاں بھی فقط حقیقت کو سمجھنے سمجھانے کیلئے باتیں ہیں۔ یعنی یہ سلسلہ آدمیت تب تک ہے جب تک آدم علیہ السلام کے مثل میں اصل کی حقیقت کا ادراک نہ ہو جائے؛ اُسے عین القلب دیکھ نہ لے۔ جب تک اس کی معروضی حقیقت تمثیلاتی گمان سے نکل کر توحید کی گواہ نہ بن جائے۔

پروفیسر امیر علی: یہ تو قدیم یونانی حکماء بھی کہتے تھے۔ یہ تو اُن کا فلسفہ ہے۔

سیّد درویش: اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام یونان کے کسی فلسفی مکتب میں زیرِ تعلیم رہ چکے تھے۔ پھر وہاں سے تھیوری لے کر فلسفۂ آدم علیہ السلام تیار کر لیا؟ یقین مانیں! تاریخ میں ایسا کوئی سفر جناب امیر علیہ السلام نے نہیں کیا۔ (سیّد صاحب نے ہنس کر جواب دیا)

پروفیسر امیر علی: لیکن ایک عقلی مماثلت تو ہے!

سیّد درویش: یہ آپ کی دُور بینی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے کہ جسم کی

طرح رُوح بھی تھک جایا کرتی ہے۔تو علم وحکمت سے اس کو توانا اور بحال کیا کرو۔ پس یہ علم وحکمت جو رُوح کی غذا ہے، وہ ہمیشہ سے غیر فانی نفس کیلئے اَبدی ذریعہ حیات ہے۔ یہ ابدی حکمت ''خردِ جاوداں'' کہلاتی ہے۔ انگریزی زبان میں اس کو The Perennial Wisdom کہا جاتا ہے، جو Agostino Steuco کی اصطلاح ''Philosophia Perennis'' کا ہی ترجمہ ہے۔ میں اگرچہ اس قسم کی ''ابدی حکمت'' کو معیار نہیں کہہ رہا، لیکن اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کبھی ختم، بوڑھی اور بوسیدہ نہیں ہوتی۔ حکمت اپنی حقیقت میں اَبدی معرفتِ حق ہے۔ یہ عقل کیلئے، عدل کا دائمی نقطہ نظر ہے۔ اس میں کسی ارتقاء کے طفلانہ، آلاتی منطق کی گنجائش تلاش کرنا خود عقل وحکمت کے نہ ہونے کی علامت ہے۔ ہم ارتقاء کو اس کے ہی آئینے میں ارتقاء کہتے ہیں۔ یہ تبدیلی کو ظاہریت بتاتی ہے، جس کیلئے یہ معنویت کا باطن ہے۔ یہ جو آپ کو نت نئی تھیوریاں، جدید انقلاباتی مظہر نظر آتے ہیں، ان کی حیثیت اور اہمیت سمندری سطح پر لہروں کا شور اور اُتار و چڑھاؤ ہے۔ وہ ہی آب، وہ ہی بحر اور خاموش گہرائی۔ خطیب منبر سلونی نے کیا حکیمانہ الفاظ میں سب کچھ ہی کہہ ڈالا: ''وقت کے ساتھ چیزیں تبدیل نہیں ہو جایا کرتیں، بلکہ صرف ظاہر ہوتی ہیں''۔

یہ ہمیں جو یونانی، ایرانی، ہندی، یورپی اور جاپانی علوم کی سطحی موجوں میں ٹکراؤ، تصادم، شور، جھاگ، سُنائی اور دکھائی دیتا ہے؛ ان سب کے نیچے ایک ہی سمندر ہے۔ یہ اسی سدابہار حکمت کا بحر ہے، جس کی طرف آقا دوجہاں نے کہا کہ ''علم حاصل کرو، چاہے چین ہی جانا پڑے''۔ پس آپ نے جس کو مماثلت کہا، وہ اُس باطنی حکمتِ ابدی کا ظاہر ہے، جو ہم نے بیان کی ہے۔

پروفیسر امیر علی: آپ نے ترک الذت پر گفتگو کرتے ہوئے صوفی حضرات کے ابلیس کے متعلق خیالات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اُن کا ابلیس کو موحد کہنا مہملِ گفتگو

ہے۔ کیا آپ فلسفۂ توحید پر اس پہلو سے ضیا پاشی کریں گے؟

سیّد درویش: اصل میں کچھ مخلص اور حساس لوگ مذہبی ریاکاروں سے اتنے شدید متنفر ہو جایا کرتے ہیں کہ وہ ہر اُس چیز کی حمایت پر اُتر آتے ہیں جو مذہبی لبادے میں ملبوس، ظالم، مکار اور منافقین کے ظاہری تقدس کو بے نقاب کر دے۔ اُن کا ماننا ہے کہ وہ کم از کم منافق نہ تھا۔ مطلب وہ شیطان۔ یہ سوچ ہمیں عیسائی Gnosticism کے مختلف فرقوں میں ملتی ہے۔ لیکن Ophitesاور Valentianism میں یہ زیادہ واضح ہے۔ یہ صوفی شکایت اگر چہ اپنی جگہ دُرست ہے لیکن ایک غلط شے دوسری غلط کی جگہ لے کر صحیح قرار نہیں پا سکتی۔

پروفیسر صاحب یہ شیطان بڑا ہر فن مولا ہے۔ آپ اگر سمجھتے ہیں کہ ہم اس ابلیس کو جو صوفی حضرات کو چمٹ گیا ہے، اُتار پھینک دیں گے تو کبھی دوبارہ نہیں اُبھرے گا؛ ممکن نہیں۔ یہ پھر اصلاح کاروں کی گودی میں بیٹھا انقلاب، ترقی، انسانیت کی خود پسندی کے نعرے لگاتا نظر آئے گا۔ پورا Proteus ہے۔

پروفیسر امیر علی: (مسکراتے ہوئے) ہم اُدھر بھی اُس کو پناہ نہیں بخشیں گے۔

سیّد درویش: تو پھر سنیئے! توحید دو ہیں۔ ایک آدم علیہ السلام کی توحید۔ دوسری ابلیسی توحید۔ دونوں موٴحد۔ ایک نبوتی موٴحد تو دوسرا ابلیسی موٴحد۔ آدم علیہ السلام کی توحید میں حق کی معرفت پائی جاتی ہے؛ جبکہ ابلیس کی قیاس پر مبنی ہوتی ہے۔ ایک عقلی طور پر پابندِ حق ہوتی ہے؛ تو دوسری قیاس میں مادر پدر آزاد سوچ، جو مجھے کبھی منصور کی ''اَنا''؛ تو کبھی ڈیکارٹ کی Cogito: کبھی جرمن کی ''Ich'' تو کبھی برطانوی انڈیا کے سر محمد اقبال کی ''خودی'' میں دُھن دھناتی پھرتی نظر آتی ہے۔

چنانچہ ابلیس جب بھی خود کو قیاس کے فریبی آئینے میں دیکھتا ہے: اُسے اللہ کا اپنی نرگسی صورت میں گمان آلیتا ہے۔ اب ایسے خوبصورت وہم والے کو سمجھائے گا کون کہ

یہ حقیقت نہیں۔بس یہ ہی ناسمجھی اُس کا کامل ایمان کہلاتا ہے۔

پروفیسر امیر علی: اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ سچ ہی کہتے ہیں:

The mirror flatters the face.

سیّد درویش: لو آپ کو آج پتہ چلا؟ اسی لیے تو خواتین آئینے کی جان نہیں چھوڑتیں۔ شیطان نے بھی براہِ راست آدم علیہ السلام کو کچھ نہیں کہا؛ بلکہ حوّا کے کان بھرے۔ شیطان کو پتہ تھا کہ وہ ہی اُسے اپنی زبان میں سمجھائے گی۔ نتیجہ آپ نے دیکھ ہی لیا۔

(سبھی یہ درد بھری حقیقت سُن کر بھرپور ہنسنے لگے۔)

(سیّد صاحب نے دوبارہ سلسلۂ کلام شروع کیا:)

اب جیسا آدم علیہ السلام، ویسی آدم علیہ السلام کی توحید۔ جیسا ابلیس، ویسی ابلیس کی توحید۔ خلافتِ الٰہیہ ایک، توحیدیں دو، مؤحد دو، قیامت تک آپس میں متصادم رہیں گے۔ ایک توحیدِ حق، دوسری توحیدِ باطل۔ یہ برحق اور حق نما مؤحدوں میں جنگ تھی۔ اب آدم علیہ السلام سے جنگ ظاہری تھی، توحیدِ آدم علیہ السلام سے باطنی، اصلی۔ ابلیس کا ہدف آدم علیہ السلام کی توحید کے باطن میں اللہ تھا۔ ابلیس کے پاس اُس کا اپنا من گھڑت خدا تھا۔ اُسی خودساختہ Self-made-god کا نام، اللہ اللہ لے کر وہ اپنی ذات کا ہی پجاری، طواف کیا کرتا تھا۔ وہ چاہتا یہ تھا کہ آدم علیہ السلام کو نافرمان ثابت کر کے خدا حقیقی، ربِّ آدم علیہ السلام پر اپنی باطل سوچ سے ظالم ہونے کی مہر لگا دے۔ اسی لیے ہم کہہ چکے کہ خبردار! اگر ہم نے آدم علیہ السلام پر ترک اولیٰ کا الزام عائد کرنے کی کوشش کی تو ہم خود ابلیسی نمائندے ثابت ہو کر انتخابِ آدم علیہ السلام میں عدلِ الٰہی کے منکر ہو جائیں گے۔ آدم علیہ السلام کا رب ابلیس کیلئے کوئی حجت نہ تھا۔ اسی لیے تو اُس نے اللہ سے معافی نہیں بلکہ مہلت مانگی۔ یہ جاہل کی علم والے کے خلاف بغاوت،

یہ خودی کا اپنے ہی فریب کے استدلال میں غیر معقول ہونا رُوحِ ابلیت ہے۔ ابلیسی روحانیت ہے۔ کون کہتا ہے کہ ابلیس اللہ کو مانتا تھا، لیکن اُس کی مانتا نہیں تھا؟ ایسی ناول نویسوں کی جعلی حکمت نما باتوں سے فکر پراگندہ ہو جانے کا شدید اندیشہ ہوتا ہے۔

پروفیسر امیر علی: آپ کیا کہتے ہیں؟

سیّد درویش: ابلیس جس کو جانتا تھا، اُسی کو اللہ مانتا تھا، اور اُسی کا مخلص پجاری تھا۔ وہ اُس کا ''اپنا'' اللہ تھا۔ وہ ''اپنے'' اللہ کی مانتا تھا۔ وہ ''اپنے'' اللہ کو حق جانتا تھا۔ اور ''اپنے'' اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرتا تھا۔

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب آپ جو فرما رہے ہیں اُس کے بعد تو ابلیس اور اللہ کی عبادت کا کوئی تعلق ہی باقی نہیں بچتا۔

سیّد درویش: تعلق تھا کون سا جو باقی بچتا؟ کون سی عبادت؟ قرآن پڑھنا نہیں، سمجھنا پڑے گا۔ وہ تو تھا ہی کافر! اللہ نے یہ دکھلایا کہ اگر جن بھی پوجا پاٹ کرتے کرتے ''معلم الملائکہ'' بن جائے تو بھی کافر ہی ہوتا ہے، فرشتوں کی صفوں میں کھڑا۔ اللہ نے سجدے کا حکم دے کر اُس کی ''خود پرستی'' کا پردہ فاش کر کے اُسے کھلم کھلا کافرین میں لا کھڑا کر دیا!

پروفیسر امیر علی: ابلیس تو کہتا تھا کہ اگر اے اللہ تُو مجھے اس سجدے سے معاف کر دے تو میں تیری ایسی عبادت کروں گا کہ کسی نبی مرسل اور ملک مقرب نے بھی نہیں کی ہو گی۔

سیّد درویش: اصل میں یہ دھوکے باز عقلی لحاظ سے اتنا احمق تھا کہ یہ سوال کی نوعیت بھی نہ سمجھتا۔

پروفیسر امیر علی: کیسے؟

سیّد درویش: عبادت کی تو بات، جھگڑا ہی نہ تھا۔ آدم علیہ السلام کون سی عبادت

کر رہا تھا؟ آدم علیہ السلام کے پاس تو علم تھا۔ اُسے خلافت علم کی وجہ سے حاصل ہوئی، ورنہ ملائکہ کو تو حمد، تقدیس اور تسبیح میں کمال یدطولیٰ حاصل تھی۔ اگر ابلیس عبادت میں سچا ہوتا تو عبد ہوتا، جب کہ اُسے اپنے عابد ہونے پر تکبر تھا۔ آدم کی توحید علمی تھی۔ یہ ملعون جب کہ قیاس میں مبتلا تھا۔ وہ اب خوشامدی کر کے اللہ کو فریب دینا چاہتا تھا۔ اُس کا مطلب تھا کہ مجھے اپنے اس احمق خلیفہ کو مت سجدہ کروا، کیونکہ تجھے خود پتہ نہیں کہ یہ نااہل ہے۔ ابلیس Self-assertion کا قائل تھا۔ اُس کی عبادت کا اصل الاصول تو صرف خودی کا استحکام تھا۔

لیکن آوازِ قدرت آئی: ”مجھے تیری عبادت کی کوئی ضرورت نہیں“۔ ”قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ لا حاجتہ لی الی عبادت“۔

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب آپ نے کہا کہ آدم علیہ السلام کے پاس خلافت کیلئے علم تھا۔ کیونکہ آپ علم الاسماء جانتے تھے۔ تو وہ اسماء کیا تھے، جن کی برباکت طاقت نے آدم علیہ السلام کو اللہ کا خلیفہ فی الارض بنا دیا؟ بلکہ توحید آدم علیہ السلام اور ابلیسیت میں علیٰحدگی کا معیارِ حق قائم کر دیا۔

سیّد درویش: اکثریت کا گمان تو یہ ہی رہا ہے کہ یہ اشیائے عامہ کے نام تھے۔ مثلاً چڑیاں، طوطے، مٹر، آلو، گوبھی، دریا، پہاڑ وغیرہ۔ البتہ یہ پتہ نہیں کہ صنعتی پیداوار یا ایجادات بھی امتحان والے دن شامل تھیں کہ نہیں؟ مثلاً کار، کوٹھی، برگر، موبائل وغیرہ۔

پروفیسر امیر علی: کیا اشیائے عامہ کو خلافتِ آدم علیہ السلام کیلئے معیاری اسماء سمجھنا منافیٔ عقل نہیں معلوم ہوتا؟

سیّد درویش: یعنی آپ ”بابرکت اسما“ کے متلاشی ہیں؛ ”خالی اسماء“ Empty Names نہیں چاہیے۔ ایسے پُرتاثیر اسماء جو باعث رحمتِ الٰہی ہوں؛ خلیفہ بنا دیں۔ ملائکہ کی عبادات سے بھی بڑھ کر جن میں برکت اور تاثیر ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم۔

پروفیسر امیر علی: خلیفہ کا مطلب، میری مراد آدم علیہ السلام کا مقامِ خلافت ہے، یا کہ تخت نشینی؟

سیّد درویش: کرسی، تخت، راج، سلطنت تو ہمارا موضوع نہیں۔ ورنہ پتہ چلے چنگیز خان، ہلاکو خان، منگو خان، نہ صرف خود باکمال اسم اعظم جانتے تھے بلکہ وراثت میں بھی بتاتے چلے گئے۔ اللہ کی خلافت اپنے تقاضوں اور نوعیت میں انسانوں کی Man-made خلافتوں سے مختلف بلکہ اکثر متصادم ہوتی ہے۔ اللہ کی خلافت اور اللہ کے نام پر خلافت، الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ خیر یہ بتائیں کہ اس دُنیا میں ظلم و جور کا جو بازار گرم ہے، کیا وہ اَن پڑھ دیہاتی، مزدُور چلا رہے ہیں؟

پروفیسر امیر علی: جی نہیں بلکہ یہ نظام چلانے والے لوگ پڑھے لکھے اور سمجھ دار ہیں۔ بڑی آ گہی رکھنے والے ہیں۔ غریب اور بمشکل زندگی کی ضروریات اکٹھی کرنے والوں کو حکومت اور سرمایہ کاری کی پیچیدگیوں سے بھلا کیا واسطہ ہو گا؟

سیّد درویش: آپ کہتے ہیں کہ دنیا کا استحصالی، سرمایہ دارانہ اور جنگ و جدل کا نظام چلانے والے اپنی آ گاہی میں نہایت پیچیدہ، جامع معلومات کے شیطانی اوزاروں اور ہتھیاروں سے دورانِ تعلیم لیس ہوتے ہیں۔

پروفیسر امیر علی: جی ہاں! یہ لوگ فقط اشیاء کے ناموں سے ہی نہیں بلکہ ان کے فارمولوں سے بھی بڑی آ گہی رکھتے ہیں۔

سیّد درویش: مطلب اسماء، فارمولے اور معلوماتی آ گہی کا بذاتِ خود برکت سے ضروری تعلق نہیں بلکہ لعنت بھی ثابت ہوتے ہیں، یعنی ایسے خالی اسماء ازخود خلافتِ الٰہیہ کیلئے ہرگز معیار نہیں قرار پا سکتے۔

پروفیسر امیر علی: میں نے اسماء کی آ گہی کے متعلق اس منفی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔

سیّد درویش: اصل میں آپ نے غور ہی ''خالی اسماء'' پر کیا تھا۔

پروفیسر امیر علی: اس کا کیا مطلب ہوا؟

سیّد درویش: آپ نے اسماء لفظ کے ساتھ ''ہم'' کی ضمیر نہ دیکھی۔ یہ بغیر ضمیر کے ''**اسماھم**'' کو ''خالی اسماء'' پڑھنے کا نتیجہ حقیقت سے خالی اسماء ہی نہیں تو اور کیا ہوگا؟ یہ ''**ھم**'' کی ضمیر عاقل افراد، ذوی العقول کیلئے استعمال کی جاتی ہے۔ پس ان ذوی العقول افراد کے ''**اسماھم**'' میں خلافتِ الٰہی کی نعمت پوشیدہ ہے۔ اُن کے ''**اسماھم**'' ہی حق، عدل اور کمال کی معروف مہریں ہیں۔ آدم علیہ السلام نام لیتا گیا، خلافت کی مُہریں لگتی گئیں۔

پروفیسر امیر علی: حیرت انگیز انکشاف ہے۔ اور کتنا معقول!

سیّد درویش: کیا $E=mc^2$ جاننے سے انسان میں کوئی اخلاقی تبدیلی آ جاتی ہے؟ بڑا بابرکت فارمولا ہے بذاتِ خود؟ کیا اس میں کوئی تہذیب، اخلاقیات، انسانیت کیلئے خاص پیغام ہے جو ہمیں خلافتِ الٰہیہ کے اہل بنا دے؟ ہاں آپ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر دنیا میں تو سلطنت بنا لیتے ہیں، لیکن میں خلافتِ الٰہیہ کی بات کر رہا ہوں۔ تو ایسا بھی ہے کہ ہم اس فارمولے سے اچھے کام لیں۔ لیکن مقدمہ یہ ہے کہ ازخود یہ فارمولے، اسماء کسی اچھائی یا بُرائی کے داعی نہیں۔ جو چاہو نتیجہ اخذ کر لو۔

پروفیسر امیر علی: جی ہاں، بلکہ عذاب، خوف میں اُلٹی لعنت کا شکار کر دیا ہے، اس آگہی کے نام پر علم نے۔ بس طیش میں آ کر ایک بٹن ہی دبنا ہے اور ساری انسانیت، ترقی اور دعوے صاف ہو جانے ہیں۔ اس انسان کی قدر، اگر آپ کے نقطۂ حق کی نظر سے دیکھیں تو مشین اور سرمایے میں ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ معلومات کے بے حد انبار نے انسان کی بجائے مشین کو خلیفہ فی الارض بنا دیا ہے۔ انسان اپنی ہی پیدا کردہ اشیاء اور سہولتوں کو پوج رہا ہے۔ آج انسان مادی ایجادات کے بتوں کو صنم بنا کر اللہ کے نام پر

پوج رہا ہے۔

سیّد درویش: تو معلوم ہوا کہ اللہ کا خلیفہ "**اسماھم**" جانتا ہے؛ لوگوں کا بنایا ہوا خلیفہ ھم کے ضمیر کی برکت سے خالی ناموں کا علم حاصل کرتا ہے۔

اب اللہ نے پہاڑوں، سمندروں وغیرہ کے آگے اپنی امانت کا بوجھ رکھا۔ لیکن کسی نے بھی اُٹھانے کا ذمہ نہ لیا۔ پہاڑوں نے بھی ذمہ داری اُٹھانے سے معذرت کر لی۔ کوہِ سینا کے پہاڑ کا حال دیکھا؟ تو جو خود ذمہ داری اُٹھانے سے ڈرتا ہو، قابل نہیں، تو اُس کا "خالی اسم" پکارنے سے آدم علیہ السلام کو خلافتِ زمین دے دی جائے گی؟ خود امانت نہ رکھنے کے قابل، امانت دلوانے کا ضامن بن سکتا ہے؟ یہ تو پہاڑ کا حال ہے۔ آگے آلو، گوبھی کا حساب آپ خود ہی لگالیں جو ہم روز پکا کر کھا جاتے ہیں۔

اچھا کسی پہاڑ نے زمین کا بوجھ اُٹھایا ہوا ہے یا زمین نے پہاڑوں کا؟

پروفیسر امیر علی: زمین پر 70% پانی، سمندر ہے۔ پھر بڑے بڑے صحرا ہیں۔ میدان ہیں۔ جنگلات ہیں۔ پہاڑ تو زمین میں میخیں ہیں۔

سیّد درویش: اچھا اللہ نے، جو حاکمِ کُل ہے، ہر چیز آدم علیہ السلام کیلئے مسخر کر دی۔

پروفیسر امیر علی: ایسا ہی ہے۔

سیّد درویش: اچھا تو آدم علیہ السلام کو خلیفہ کیا پہاڑ بنائے گا جو خود زمین پر فقط کیل ہے؟ کیا خلیفہ الٰہی بننے کیلئے ضرور یہ جاننا ہے کہ کیل کیا ہوتا ہے؟ کیا شعور پایا ہے اُس نے جو یہ سمجھا بیٹھا ہے۔ پس محکوم، مسخر شدہ موجودات، جس میں خود زمین بھی شامل ہے، کے نام لے کر آدم علیہ السلام کی خلافت کو ثابت کرنا گویا بیل کے آگے چھکڑا رکھنا ہوگا۔ جو خود اپنی حقیقت میں محکوم ہو، اُس کے فقط نام کی طاقت اپنے ہی اوپر حاکم مسلط کر کے حاکم سازی کرے گا؟ ایسی منطق تو اگر خود پہاڑ کے سامنے بھی رکھی جائے کہ

تمہارے نام کی پہچان میں اتنی طاقت ہے کہ آدم علیہ السلام کو تمام زمین پر خلیفہ بنا دیا؛ اُس کی آنکھیں گھبراہٹ سے باہر آ گریں گی۔

پروفیسر امیر علی: وہ ''اسماھم'' کن عالی مقام ہستیوں کے ہیں، جن کی معرفت کے عوض آدم علیہ السلام کے استحقاق سامنے ملائکہ کو بھی سجدہ ریز ہونا پڑا؟ جن کے نام کی معرفت میں خلافت کی ضمانت ہیں؟ حق و باطل؛ عدل اور ظلم؛ ابلیسیت اور آدمیت کے درمیان عقل کیلئے علم کی کسوٹی کے قیام میں وہ کون باشعور ہستیاں ہیں؟

کیونکہ آدم علیہ السلام نہ کوئی قاموسی طوطا تھا، نہ اُس کا ملائکہ سے یہ مقابلہ تھا کہ کس کی Hard Disk میں زیادہ Data ہے۔ وہ عطا کردہ علم تھا کیا؟

سیّد درویش: ضمانت کون دیتا ہے، اعلیٰ کہ ادنیٰ؟

پروفیسر امیر علی: اعلیٰ۔

سیّد درویش: یعنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسماھم اُن باشعور ہستیوں کے ہونے چاہیے جو آدم علیہ السلام سے اعلیٰ ہوں، نہ کہ زمین اور اُس کی موجودات کی طرح ادنیٰ اور محکوم۔

پروفیسر امیر علی: تب ہی تو قابلِ قبول ضمانت ہوسکتی ہے۔

سیّد درویش: پس طے پا گیا کہ خلافت اُن کے اسماء کے عوض آدم علیہ السلام کو ملی، جو ''ھم'' کی ضمیر میں عالین ہیں۔

پروفیسر امیر علی: وہ عالین سیّد صاحب کون ہیں؟

سیّد درویش: وہی جن سے شجرہ آدم علیہ السلام میں حسد ممنوع کیا ہے۔ وہ جن میں آدم علیہ السلام نے اللہ کی ولایہ کی خوشبو سونگھی۔ جن کے خوشبودار ہونے کو جاننے کی معرفت میں آدم خلافت کا مستحق قرار پایا۔ کیا آپ اُن کو نہیں جانتے؟

پروفیسر امیر علی: جی ہاں قرآن میں عالین کا ذکر ہے۔ اللہ نے ابلیس سے

پوچھا: کیا تُو عالین میں سے ہے؟ لیکن ہم میں اُن کو اس ذکر کے علاوہ از خود جاننے کی بصیرت نہیں۔ ہمیں تو ایک خاص حد کے بعد بصارت بھی جواب دے جاتی ہے۔ پس تا قیامت اور قبل از تخلیق کے متعلق کچھ بتانا فقط قیاس آرائیاں ہی ہوتی ہیں اور بس۔

سیّد درویش: کیا نیوٹن کی ''اُصولِ ریاضی'' یا ''آئن سٹائن'' کا ''نظریہ اصنافیت'' سکول کا طالب علم بچہ سمجھ سکتا ہے جس کو ریاضی اور طبیعیات شروع کیے دو دن گزرے ہوں؟

پروفیسر امیر علی: بالکل ممکن نہیں۔

سیّد درویش: ایسا طالب علم آئن سٹائن یا نیوٹن کی جگہ اُن کی تھیوریاں یونیورسٹی میں پڑھانے کیلئے لے سکتا ہے؟

پروفیسر امیر علی: دیوانوں کی باتیں ہیں۔ اس کیلئے اعلیٰ درجے کی سند یافتہ اہلیت درکار ہوتی ہے۔

سیّد درویش: کیسے حاصل ہو؟

پروفیسر امیر علی: مخصوص تعلیم کے طریقہ کار سے گزرنے کے بعد طبیعیات و ریاضی کے شعبہ جات میں ماہرین کی باقاعدہ آزمائش و تحقیق کے بعد اُس کو اہل ہونے کی سند حاصل ہوگی۔

سیّد درویش: اچھا اگر آئن سٹائن اپنی زندگی میں ہی کسی کو اپنا وارث قرار دے کر کہے کہ جو رموز و اسرار میرے نظریے میں ہیں، میرے بعد اُس فلاں میرے وارث سے دریافت کرتے رہنا، تو اُس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا کسی تیسرے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ اُس سے بھی سند لی جائے؟

پروفیسر امیر علی: تیسرا تو اب ہو ہی غیر ضروری جاتا ہے۔

سیّد درویش: تو آیئے پھر قرآن میں عالین کون ہیں، خود قرآن کے ہی وارثوں

سے پوچھتے ہیں جو اس کے علم میں راسخون ہیں۔ صدیقین ہی بتائیں گے۔

پروفیسر امیر علی: وہ ہی چارہ گر ثابت ہیں۔

سیّد درویش: تو سنیئے عالین کون تھے وہ صادق آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبانی: "اللہ کی ذات موجود تھی اور کوئی چیز نہ تھی۔ اپنے نورِ جلال سے پانچ تن پاک علیہم السلام کو پیدا کیا۔ ہر ایک کو اپنا نام عطا کیا۔ خود حمید ہے تو آنحضرت کا نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رکھا۔ خود اعلیٰ ہے تو امیر المومنین علیہ السلام کا نام علی علیہ السلام رکھا۔ اپنے اسمائے حسنہ سے حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کے نام مشتق کیے۔ خود فاطر پیدا کرنے والا تو اپنے ناموں میں سے فاطمہ علیہا السلام کا نام رکھا۔ ان کو پیدا کرنے کے بعد عالمِ میثاق میں رکھا۔ یہ حضرات عرش کے دائیں طرف قیام فرما ہوئے۔ فرشتوں نے جب پانچ تن پاک کو دیکھا تو ان کی عظمت اور شان کو ملائکہ نے بڑا جانا اور تسبیح پڑھنا شروع کی۔ آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، عرش کی دائیں جانب۔ انوارِ خمسہ نجباء کو دیکھا جب آدم علیہ السلام نے، تو عرض کیا کہ پالنے والے یہ کون ہیں؟ فرمایا: اے آدم! میں نے ان برگزیدہ اور خاص ہستیوں کو اپنے نورِ جلال سے خلق کیا ہے۔ ان کے نام اپنے ناموں سے مشتق کیے ہیں۔ عرض کیا: پالنے والے! تیری ذات کا واسطہ! ان کے نام تو بتا۔ فرمایا: یہ میرا راز ہیں۔ اور تمہارے پاس امانت ہیں۔ میری اجازت کے بغیر تمہارے سوا ان کو کوئی نہ جانتا ہو۔ عرض کیا: پالنے والے ایسا ہی ہو گا۔ فرمایا میرے ساتھ وعدہ کرو۔ اللہ نے آدم علیہ السلام سے وعدہ لے کر پانچ کے نام بتا دیئے۔ تمام فرشتوں پر پیش کیے؛ فرشتے پہلے آگاہ نہ تھے۔ (تفسیر فرات)

پروفیسر امیر علی: راسخون فی العلم کی خبر کے بعد، کسی شقی القلب کے حصے میں ہی شک وشبہ رہ جائے گا۔ سیّد صاحب میں کافی عرصہ دورانِ گفتگو چاہ رہا تھا کہ راسخون اور علم کے درمیان یہ "فی" کا کیا تعلق بنتا ہے؟

سیّد درویش: ''فی'' نہایت فطرتی تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ وہی جو مچھلی اور پانی میں پایا جاتا ہے۔ آپ مچھلی کو پانی کے بغیر تصور کر سکتے ہیں؟ کیا مچھلی کو پانی میں کوئی تیرنے کا طریقہ سکھاتا ہے؟ مچھلی کا وجود ہی پانی سے ہے۔ پانی مچھلی کی خاص، حیاتی صفت ہے۔ پانی، مچھلی کے بغیر پانی ہے، جوں ہی مچھلی آئی، پانی کی حقیقت مچھلی کو سمجھنے کیلئے ماحولیاتی ہو جاتی ہے۔ کوئی نحل کو شہد بنانا سکھاتا ہے؟ شہد علامت ہے نحل کی۔ کیونکہ اُس میں خامرہ Sucrase ہوتا ہے، جو گھریلو مکھی کسب کر ہی نہیں سکتی۔

پروفیسر امیر علی: سیّد صاحب میں راسخون کے علم سے فطرتی تعلق کو اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ آپ نے شجر ممنوعہ کو شجرِ حسد کہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آخر میں اس شجر کی حقیقت پر روشن بحث ہونی چاہیے۔ ہماری جو گفتگو آدم علیہ السلام کے موضوع پر شجر کی ظاہریت سے چلی، اب اُس کی حقیقت شجرے پر آ پہنچی ہے۔

سیّد درویش: عالین کے شجرے کو شجر کی علامت میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اور ساتھ یہ تنبیہ کی کہ ان عالین سے جو اہلِ شجرہ ہیں، حسد ممنوع ہے۔ یہ درخت پس Geneological Symbol ہے۔ آدم علیہ السلام انسان کو عملی طور پر تعلیم دیتا ہے کہ اے غافل بشر، اس کے شجرے سے اللہ عالین کو پھل کی صورت میں پیدا کرے گا۔ ان پھلوں کی اہمیت کیلئے یہ جاننا کافی ہے کہ آدم علیہ السلام کی حیثیت اپنے شجرے میں شجر کی سی رہ جاتی ہے۔ دیکھیں پھل تو بیج میں شجر سے پہلے ہی پوشیدہ موجود ہوتا ہے۔ یہ پھل ہے جو شجر کو استعمال کرتا ہے اپنی برآمدگی کیلئے۔ یہ تنا، یہ شاخیں، یہ پتے، سب کے سب ''باعث'' ہوتے ہیں۔

آدم علیہ السلام نے Propaedeutically پھل کھا کر بتا دیا انسان کو کہ اگر کسی نے اُس کے شجرے میں عالین سے حسد کیا تو جنت میں داخل ہونا تو دُور، جنت میں داخل ہوئے بھی باہر نکال پھینک دیئے جاؤ گے۔ یہ ان ہی عالین کے اسماھم تھے جو

بولے حضرت آدم علیہ السلام نے، جن سے حسد ممنوع ہے۔ اور جن کو پکارنے والے کلمات میں اُس نے مغفرت پائی۔ تین مقامات پر آدم علیہ السلام نے انسان کو عملی طور پر معرفت، محبت اور مغفرت کی تعلیم و ہدایت کی۔

پس حضرت آدم علیہ السلام کا معاملہ کوئی المیہ Tragedy نہ تھی، بلکہ اطالوی ڈانٹے کی طرح میں کہوں گا کہ یہ قصہ The Divine Comedy of Adam ہے۔ جس کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ قرآن کے الفاظ میں جوہری حرکت کے Paradox کو جانا جائے۔

(سیّد صاحب نے کلام ختم کیا۔ پروفیسر امیر علی جوابات پر غور و فکر میں مصروف معلوم ہوتے تھے۔ اب مولوی حامد رضا بولے)

مولوی حامد رضا: کچھ ایام پہلے میں غلام احمد پرویز کی کتاب ''مقامِ حدیث'' اور ''ابلیس و آدم'' کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اُنہوں نے حدیث اور آدم کے حوالے سے جو گفتگو کی، میں چاہتا ہوں کہ آپ اُس پر روشنی ڈالیں!

سیّد درویش: جی کیا فرماتے ہیں پرویز صاحب؟

مولوی حامد رضا: وہ امام ذہبی کی کتاب ''تذکرۃ الحفاظ'' سے اقتباس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے 500 احادیث، جو اُنہوں نے اکٹھی کر رکھی تھیں، وہ نیست و نابود کر ڈالیں۔ اپنے زمانے میں حضرت عمرؓ نے اعلان کیا کہ جس کسی کے پاس علاوہ قرآن جو کوئی حدیث ہو لے آئے۔ جب سبھی لوگ لے آئے تو آپؓ نے جلا کر ختم کر ڈالی۔ بحوالہ طبقات ابن سعد، جُز خامس۔ اور کہنے لگے: کیا تم لوگ اہلِ کتاب کی طرح احادیث کا مثناہ بنانا چاہتے ہو؟ اس کے بعد خلفائے ثلاثہ میں سے غالباً حضرت عثمان کا ایک قول بیان کرتے ہیں کہ اُنہوں نے فرمایا: ''تم جب آج اختلافات کرتے ہو تو آئندہ نسلیں اور بھی اختلافات کریں گی۔ لہٰذا رسول اللہ سے کوئی روایت نہ

کرو۔ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دو ہمارے تمہارے درمیان قرآن ہے''۔

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ پھر ہوا یوں کہ بنواُمیہ، جنہوں نے خلافتِ راشدہ کو ملوکیت میں بدلا، اُنہیں جعلی احادیث کے کارخانے بنانے کا سنہرا موقعہ مل گیا۔ اس کے بعد آپ امام بخاری پر یوں تنقید کرتے ہیں کہ اُن کو چھ لاکھ احادیث یاد تھیں جن میں سے فقط 7300 منتخب کیں۔ آخر باقی کیوں مسترد کیں؟ کسی کو کیا پتہ کہ کون سی صحیح احادیث بھی ضائع کر ڈالیں؟ کس نے اُن کو اختیار دیا کہ وہ کون سی صحیح اور کون سی غلط حدیث ہونے کا فیصلہ کریں؟

سیّد درویش: مقامِ حدیث کو سمجھنے کیلئے پرویز صاحب کی رائے پر تنقید کو خلافتِ ثلاثہ، خلافت بنواُمیہ اور زمانہ امام بخاری کے تین حصوں میں تقسیم کر کے باہمی عوامل و اثرات کو سامنے لانا ہوگا۔

دیکھیں پرویز صاحب نے آدھا سچ بتایا ہے۔ لیکن آدھ سچ اُن کی بدنیت تنقید نے چھپا لیا ہے۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب وہ کیسے؟

سیّد درویش: دیکھیں خلیفہ اوّل کا زمانۂ خلافت بالکل دورِ نبوت سے متصل تھا۔ اِدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو آخری آرام گاہ میں اُتارا ہی تھا کہ اس سے فوری پہلے سقیفہ بنوساعدہ کے ایک ہنگامی اجلاس میں حضرت ابوبکر کو خلیفۂ مسلمانان بنا لیا گیا۔ مطلب خلافت اوّل اور حیاتِ رسول اللہ میں کوئی وقفہ نہیں آیا۔ بلکہ ایک کا آغاز دوسرے کے اختتامیے سے Overlap کر رہا ہے۔ اور ہم شے کی اصل کے جتنا نزدیک ہوتے ہیں، ملاوٹ کا اندیشہ اتنا ہی کم ہوگا۔ جوں جوں فاصلہ بڑھتا ہے، حقیقت سے دُوری ہونا شروع ہو جائے گی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے 500 احادیث حیاتِ مبارکہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں خود اکٹھی فرمائیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تصدیق کیلئے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی موجود ہوں؛ لکھنے والے خود یارِ غار اور صدیق ہوں؛ تو غلط حدیث کیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن کے مجموعے میں جمع ہوتی؟ سوال یہ پیدا ہو گیا کہ ایسے خالص خزانے کو کیوں نذرِ آتش کر کے کھو دیا گیا؟ یہ ہی آئندہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ نے دُہرایا۔

یہاں کیوں پر بحث ہمارے لیے غیر موزوں ہی معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت واقع یہ ہی تھی کہ ایسا ہوا۔ مسئلہ یہ آ ٹپکا کہ ان صحیح ترین احادیث کی ناپیدی سے ایک منفی دباؤ Negative Pressure پیدا ہو گیا۔ معاشرے میں اقوالِ نبوی کیلئے ایک Demand Vaccum نمودار ہونے لگا۔ اور کوئی معمولی تبدیلی نہ تھی کہ مکہ کی جگہ مدینہ میں سیاسی طاقت آ گئی۔ ایک نہایت بنیادی سطحوں پر عالمگیر مذہب کا انقلاب برپا ہوا ہے۔ اس مذہب کو ہر قسم کے اپنے زمانے میں پیش آنے والے سوالات کا جواب دینا تھا۔ وہ سوال نجد کا بدّو کرے یا مصر و ایران کے فلسفی۔ اور جواب آپ نے قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے مطابق دینے ہیں۔ اس طرح ایک نئے نئے اسلامی، مذہبی معاشرے میں اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں، یادوں اور ہدایتوں کی کمی کا یہ احساس زیادہ دیر تک تشنہ تو نہیں رہ سکتا تھا۔ اس مصنوعی منفی دباؤ کے خلاء کو پُر ہونا ہی تھا۔ اگلا سوال و مرحلہ یہ آتا ہے کہ کسے اور کون پُر کرے گا؟ اس مقصد کیلئے دو فریقین آگے بڑھے۔ ایک طرف اہل بیت علیہم السلام، تو دوسری طرف بنواُمیہ۔ اہل بیت علیہم السلام اور اُن کے شیعان کو تو جان کے لالے ڈال دیئے گئے۔ اُن کی احادیثِ آئمہ علیہم السلام نہایت محدود اور تقیے میں تھیں۔ جبکہ حکومت اقتدار و اختیار کی ساری مشینری وضع احادیث کیلئے بنواُمیہ کے ہاتھ میں تھی۔ اب اُنہوں نے حدیث کا خلاء بھرنا ہی تھا۔ کاش! وہ 500 احادیث از قلم خلیفہ اوّل بذاتِ خود ضائع کر کے وہ منفی دباؤ شروع نہ کرتے جو آئندہ بنوامیہ کی وضع احادیث کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ پس یہ بنوامیہ اور امام

بخاری کی احادیث نتیجہ تھیں اُن وجوہات کے ردِّعمل میں جو خلافتِ ثلاثہ میں رونما ہوئیں۔اس طرح پرویز صاحب اُلٹی گنگا بہانے کے چکروں میں ہیں۔

مولوی حامد رضا: خلفائے ثلاثہ کو کیا کرنا چاہیے تھا؟

سیّد درویش: جس طرح تدوینِ قرآن کیلئے باقاعدہ کمیٹی بنائی گئی؛ احادیث کیلئے بھی صحابہ کرامؓ پر مشتمل کمیٹی کا قیام ہونا ضروری تھا۔ وہ لوگ آپس میں صلاح ومشورے سے احادیثِ حقہ جمع کرنے کیلئے لائحہ عمل تیار کرتے؛ تاکہ آئندہ غیر مستند احادیث کے فتنے کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہوجاتا۔

خلافت کیلئے اگر شوریٰ کا قیام کیا جا سکتا تھا،تو حدیث کا معاملہ بھی صحابہ کرام پر مشتمل ایک ''حدیث کمیٹی'' کے سپرد کر دیا جانا چاہیے تھا۔ اگر قرآن کمیٹی کی طرح، حدیث کمیٹی اُس وقت تشکیل دے دی گئی ہوتی تو بنواُمیہ، مسانید اور صحاح پر تنقید کیلئے موقعہ ہی نہیں بچنا تھا۔

مولوی حامد رضا: یعنی ''حدیث کمیٹی'' بنانا لازم وملزوم تھی۔آپ یہ سمجھتے ہیں۔

سیّد درویش: آپ کیوں نہیں سمجھتے؟ اگر قرآن کمیٹی ہوسکتی تھی، خلافت کمیٹی ہو سکتی تھی،تو حدیث کمیٹی بنانے میں کیا دقّت تھی؟ خلافت تو بنوعباس کے بعد قریشیوں کے ہاتھ سے نکل کر عجمیوں کے ہاتھ چلی گئی؛ آج خلافت ختم ہو چکی ہے۔ جبکہ قرآن کے ساتھ حدیث کو تو قیامت تک رہنا ہی رہنا ہے۔اس کا مستقل انتظام کرنا تھا۔ کیوں چھوڑ دیا اہلِ تحریف کے رحم و کرم پر؟ قرآن کا اسلام میں حکمت و احکام کی تعلیم کیلئے Definitional- مقام ہے۔جبکہ حدیث کا مقام Ampliative ہے۔

مولوی حامد رضا: آپ اس باہمی تعلق پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔ تاکہ حدیث کا کردار اور اہمیت اُجاگر ہوجائیں۔

سیّد درویش: آیاتِ قرآنی کا نزول کسی معاشرتی خلاء میں نہیں ہوا تھا۔ قیامت

تک مسائل کو اہلِ عقل کیلئے اس میں بیان فرما دیا گیا ہے۔ اس کی با قاعدہ تشریحات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خود ساتھ ساتھ کرتے چلے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم زندگی کے ہر شعبے میں قرآن کی حکمت و ہدایت کو مختلف پہلوؤں اور ضروریات کے مطابق، دنیاوی اور روحانی سطحوں پر تعلیم کرتے آئے۔ آپ اسلام کے ربانی مبلغ تھے، کبھی گھر میں، کبھی بازار میں، کبھی مسجد میں، تو کبھی میدان میں۔ آپ کسی حجرے میں بیٹھے، کوئی کتاب نہ تصنیف کر رہے تھے۔ آپ کا مقصد صرف آیات پڑھنا ہی نہ تھا۔ بلکہ قرآن کہتا ہے کہ آیات پڑھ پڑھ کر ''با قاعدہ تعلیم'' دینے آئے تھے۔ دن رات تعلیم و ترتیب اُمت کی کرتے تھے۔

ایسا نہیں ہوتا تھا کہ وحی آئی، صحابہؓ کو سنائی اور سنا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم واپس گھر چلے گئے۔ بلکہ 23 سال جامع تعلیمات آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبانِ پاک سے مسلسل جاری رہیں۔ تو کہاں گیا وہ ساری تعلیمات کا عظیم دفتر اور زریں کان؟

اس طرح تو احادیث کا انکار یہ کہہ کے کر دینا کہ کسی حدیث کی کوئی ضمانت نہیں، ایسے ہی ہے کہ پرویز صاحب ہاتھی کو غسل خانے میں بند کر دینا چاہتے تھے۔

کون اہل علم و مطالعہ، وضع احادیث کے معاملے سے ناواقف ہوگا۔ لیکن اس کا کیا مطلب ہے کہ رُوحِ حدیث کا ہی انکار کر بیٹھیں۔ جہاں پھول ہوتے ہیں، وہاں کانٹے بھی تو ہوں گے۔ اگر کسی کو آنکھوں کی الرجی ہوگئی تو اس کا علاج ہے۔ علاج کروانے کی بجائے کیا آنکھیں نکال لیں، یا سورج توڑ دیا جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ مطلب H.G.Wells کے ناول The Country of the Blind بنا لیا جائے؟ وہ اندھوں کی ایسی بستی تھی جہاں کے باسیوں کا ایمان تھا کہ نہ کوئی سورج ہے، نہ پہاڑ، نہ درخت، نہ پرندے وغیرہ۔ وہ کہتے تھے یہ سب افسانے، کہانیاں ہیں، جو اُن کے شعراء اور اسلاف بچوں کا دل بہلانے کیلئے اُنہیں سناتے آ رہے ہیں۔

مولوی حامد رضا: لیکن پرویز صاحب کیلئے حُجت صرف قرآن ہے۔ اُن کا ماننا ہے کہ حدیث اور تاریخ عجمی سازش ہیں۔ سارا فساد تاریخ اور احادیث وضعی کا نتیجہ ہے۔

سیّد درویش: (ہنستے ہیں) قرآن ہمارے لیے حجت نہیں۔ یہ راسخون فی العلم کیلئے حُجت ہے۔ ہمارے لیے تو قرآن نے متشابہیات اور محکمات میں آیات کو تقسیم کر کے وارثان کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔

جہاں تک حدیث، تاریخ اور عجمی سازش کا تعلق ہے تو اس نظریہ سازش The Conspiracy Theory میں مشرکینِ مکہ ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ اُن کا الزام ہی یہ تھا کہ قرآن کسی عجمی کی بتائی ہوئی داستانوں کا مجموعہ ہے۔ اب اِن قرآن پرستوں سے کوئی پوچھے کہ فساد کی جڑ خود قرآن میں تو ابلیس ہے؛ تم نے عربی، عجمی والا چکر کدھر سے پڑھ لیا ہے۔ قرآن میں حق اور باطل، عدل اور ظلم کے ساتھ ساتھ عقل اور جُہل کی بات ہے۔ یہ عربی اور عجمی والی تقسیم تو سمجھ سے باہر ہے۔ ایک عالمگیر دین ایسی متعصب قیاس آرائی کی اجازت دے سکتا ہے؟

مولوی حامد رضا: جب ابلیسی سوچ ہی قرآن میں فساد کی جڑ ہے تو یہ حدیث کی کیوں صریحاً مخالفت کرتے ہیں؟

سیّد درویش: آپ نے کبھی غور کیا کہ جب ان حضرات نے مطلب نکالنا ہوتا ہے تو حدیث اور تاریخِ اسلام کیا، یورپی اور غیر یورپی تواریخ بھی بڑے شوق اور فخر سے بطور حوالے پیش کریں گے۔ اصل ان کا تاریخ اور حدیث سے اختلاف یہ ہے کہ اُن کو یہ قابو نہیں کر سکتے۔ وہ اِن کے قیاس کو آگے نہیں چلنے دیتے۔ خود ان کا قیاس تنقید کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ اصل میں آپ کو شکوہ یہ ہے کہ تاریخ و حدیث ان کی خواہش کے مطابق نہیں چلتے۔ قرآن کا ان کو یہ فائدہ ہے کہ وہ صامت ہے۔ جہاں چاہو اس کی متشابہ آیت کو محکم بنا کر اپنی بات پر مُہر لگوالو۔

مولوی حامد رضا: حدیث اور تاریخ میں وہ خاص کیا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کل کا انکار نہ کیا تو وہ جُز ان کو آگے نہیں بڑھنے دے گا۔

سیّد درویش: یہ سارا چکر مولوی صاحب ''خود تفویضی'' کا ہے۔ یہ چاہتے ہیں مکمل من مانی۔ اس بات کو یہ جانتے ہیں کہ اُن کو یہ خود مختاری اُس وقت تک حاصل ہو نہیں سکتی، جب تک قرآن کے وارث، راسخون فی العلم، عترتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث اور تاریخ گواہی دینا چھوڑ نہ دیں۔ یہ تو محال ہے۔ اب ان کے پاس ایک ہی حل ہے کہ حدیث اور تاریخ کا یکسر انکار کر دو۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ حدیث اور تاریخ کا حوالہ و مطالعہ، وہی جائز قرار دیں گے جس میں عترتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نظر نہ آئے۔ چنانچہ انکارِ حدیث و تاریخ کے پیچھے اصل مقصد عترت علیہم السلام کی جگہ قرآن کی وراثت ضبط کرنا مقصود ہے، خود تفویضی میں۔

مولوی حامد رضا: پرویز صاحب ''ابلیس و آدم'' میں کیوں ''خودی کے استحکام'' پر زور دیتے ہوئے اس کو رُوحِ اسلام کہتے ہیں۔

سیّد درویش: یہ ہی خود تفویضی اُن کی عترتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف، رُوحِ اسلام ہے۔ یہ حقیقت میں اُن کی Replacement Ideology ہے۔ یہ حضرات قرآن سے اہل موَدت کو ''عالمانہ انکاری'' کے تیر مار مار کر چاہتے ہیں کہ نکال کے ایک مصنوعی خلاء پیدا کر دیں۔ جس میں راسخون فی العلم کا وجود باقی نہ رہے۔ اس کے بعد اس ''جعلی کمی'' کو پُر کرنے کیلئے یہ اپنی ''خودی'' پیشِ خدمت کر دیتے ہیں۔ جی ہاں، یہ اپنی ''خودی کا گھوڑا'' Hobson کی طرح ہر حدیث کو، جس میں عترت علیہم السلام کی معرفت کا اندیشہ ہو، جھٹلا کر فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ عترت علیہم السلام کا سورج ''اُن اندھے باسیوں'' کی طرح تاریخ و حدیث کی روشنی میں دیکھنا برداشت کر ہی نہیں سکتے۔ پرویز صاحب اپنی اس Replacement Ideology میں خودی استحکامی کے نام

پر تفویضی معتزلہ ہیں۔ یہ ''تفویضی آئیڈیالوجی'' جوان کا قرآن، اسلام اور ترقی میں تبلیغ کا مقدمہ ہے، اُن کو سر محمد اقبال سے فکری وراثت میں ''خودی'' کے نام پر ملا۔ اس ''معتزلی خودتفویضی کی Replacement Ideology کا نام اُنہوں نے ایمان اور عشق بھی پکارا۔ ایسی مطلق العنان خودی، جو اپنی تفویض میں نہ حدیث کی پابند ہو، نہ تاریخ کی۔ جہاں دیکھا کہ خودی کے تضاد کو سورج معروضی طور پر عیاں کرنے لگا ہے، فوراً ایمان کی انگوٹھی پہن کر غائب ہو گئے۔

یہ خودی کی تفویضی فطرت بھی کیا کمال بلا ہے! اگر جنات اور ملائکہ بھی اس کے راستے میں رکاوٹ آ جائیں تو اُن کو بھی انکار کی پھونک مار کر ہوا میں غیر حقیقی بنا کے قانونی قید میں اُڑا دیتی ہے۔

مولوی حامد رضا: آپ کے نزدیک سیّد صاحب خودی، حجت اور قرآن میں کیا تعلق ہے؟

سیّد درویش: خودتفویضی، نرگسیت ہے۔ وہ قرآن کے آئینے میں خود کے ہی عکس کو حجت کہتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ قرآن حجت ہے۔ حالانکہ قرآن، راسخون فی العلم کیلئے حجت ہے۔ جب کہ ہمارے لیے خود عترتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ثقلِ اصغر حجت ہیں۔ حجت کا مطلب ہی ہے وہ جس کی طرف جب ہم مسئلے کی تحلیل کیلئے رجوع کریں تو وہ حل فرما دے۔ قرآن تو خود کہتا ہے کہ راسخون فی العلم کی طرف رجوع کرو، جو میرے ایسے وارث ہیں کہ میں اگر ثقل اکبر ہوں تو وہ ثقل اصغر۔ دونوں مل کر ثقلین کہلاتے ہیں۔ عقل کو ان کی طرف تلاش میں بھیجا گیا ہے۔

حجت کو چھوڑ کر جب آپ ابلیس کی طرح خودی کی تفویض میں آیات کی تشریح کریں گے تو فرقے اور فسادات ہی پیدا ہوں گے۔ یہ غلط احادیث تو قرآن میں خود تفویضی کے اثرات کی صورت ہیں۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب! آپ کا راسخون فی العلم کو قرآن میں حجت ثابت کرنا حدیثِ ثقلین کی روشنی میں قابلِ احترام ہے۔ لیکن غلام احمد پرویز کا کہنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دور میں ہی اُمت قرآن کو سمجھنے میں خود کفیل ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہ بڑے دوٹوک طور پر لکھتے ہیں کہ ''قرآن نورِ مبین اور مفصل کتاب ہے۔ جس کو اس کے اوّلین مخاطب یعنی صحابہ کرام بے تکلف سمجھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس کے الفاظ و معانی کی تشریح کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔ کُل زمانۂ نبوت میں قرآنی تعلیمات کے متعلق صحابہ نے جس قدر باتیں پوچھیں وہ امام رازی کے بیان کے مطابق 14، جبکہ عبداللہ ابن عباس کی روایت میں صرف 12 ہیں۔ ان سب کے جوابات قرآن میں ہی نازل کیے گئے، جو علامہ سیوطی کی ''اتقان'' میں، نیز ''مختصر جامع بیان العلم'' کے آخری صفحہ میں ایک ایک کر کے گنا دیئے گئے ہیں''۔

سیّد درویش: تخلیق سے قبل کا، تخلیق کا، تخلیق کے بعد کا، سارا علم، قرآن میں محفوظ ہے۔ لیکن! آیات کی صورت میں۔ جبکہ قرآن کا نزول مکمل ہو گیا، فقط 23 سالوں میں۔ میرا سوال یہ ہے کہ تمام اصحاب صرف 23 سالوں میں ازل سے اَبد تک ہر شے کا علم جان گئے؟ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تو قلب پر قرآن اُترا اور وارثوں کو علم منتقل ہو جاتا ہے۔ چلو یہ لدُنی علم والے تو ہماری بحث سے بالا قوانینِ الٰہی سے متعلق ہیں، لیکن غیر معصوم قرآن کے علم کا دعویدار بن جائے، یہ بات ہضم ہونے والی نہیں۔

علم تو انسان میں ملکوتی صفات پیدا کر دیتا ہے۔ تو جب سبھی کو سارا علم تھا تو مدینے کے چھوٹے سے شہر میں حضرت عمر فاروقؓ کو پولیس کا نظام رائج کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ کیا فرشتوں میں جرائم ہوتے ہیں کہ جن کی روک تھام یا شرعی سزا کیلئے کسی نے سنا، پڑھا یا دیکھا ہو کہ پولیس کا نظام ہوتا ہے؟

قرآن کا تو ایک ہی نقطۂ توحید، نقطۂ نظر ہے۔ اگر سارے ہی فرشتہ صفت اُس نقطۂ

نظر پر اکٹھے تھے تو باہمی اختلافات، تصادمات، خانہ جنگیاں کیوں رُونما ہوگئیں؟ حضرت عثمان غنیؓ کو مدینے میں دِن دہاڑے باغیوں نے نہ صرف شہید کر دیا، بلکہ تین دن لاش کو دفن نہ ہونے دیا۔ تو کہاں تھے اہل مدینہ؟ کیوں جمل اور صفّین کے معرکے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نفسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مابین برپا ہوئے؟

مولوی حامد رضا: کس قدر بنیادی سوال ہے؛ جو شاید یہ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔

سیّد درویش: کیا سبھی اس وقت ایک ہی قرآن پر متفق نہ تھے؟

مولوی حامد رضا: بالکل تھے۔

سیّد درویش: اُس وقت زمانۂ علی علیہ السلام تک کوئی احادیث کے فتنے کا شور؟

مولوی حامد رضا: یہ فسادات اور خانہ جنگیاں تو وضع احادیث سے پہلے رونما ہوئیں۔

سیّد درویش: اس خوفناک باہمی قتل و غارت کا سبب یہ تھا کہ ہر کسی کی تشریح اپنی اپنی تھی؛ کوئی عترتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پرویز صاحب کی طرح وارثِ قرآن اور راسخون فی العلم ماننے کیلئے تیار نہ تھا۔ ہر کوئی آیاتِ قرآنی کی اپنی اپنی تفسیر بالرائے کرتا تھا۔ تو اختلاف کی جڑ وضع حدیث میں مت ڈھونڈو؛ توجہ کو دھوکہ نہ دو۔ بلکہ؛ تفسیر بالرائے بلا راسخون فی العلم میں پائی جاتی ہے۔ کیا پتہ چل گیا کہ قرآن کافی نہیں؟ حدیث ثقلین کچھ سمجھ آئی؟

مولوی حامد رضا: لیکن اِن فتنہ وفسادات کا کرتا دھرتا تو عبداللہ بن سبا بتایا جاتا ہے۔

(سیّد صاحب اور پروفیسر امیر علی ہنسنے لگے:)

مولوی حامد رضا: کیوں کیا ہوا؟

سیّد درویش: یہ عقل کی بھونڈی اور تاریخ کا مذاق ہے۔ عبداللہ بن سبا کا یہ افسانہ

سیف بن عمر تمیمی نے اپنے اُموی آقاؤں کے اقتدار کے استحقاق واسطے گھڑا تھا۔ جس طرح پرویز صاحب نے تمام تاریخی واقعات کو جھٹلانے کا حل ہر بدذائقہ حدیث کے انکار میں ڈھونڈ لیا ہے؛ بالکل ویسے ہی تاریخ کے مطالعہ کو مفلوج از حقیقت بنانے کیلئے تمام حقائق اور کرداروں کا بستر اگول کرنے کیلئے سیف بن عمر نے مذہب ارجاء کی طرح حکومت واسطے جارج اُردول George Orwell کا سنوبال Snowball بنا کر تاریخ کے منکرین اور حقائق کے بھگوڑوں، جو اہلِ ظلم کیلئے میٹھا اور نرم گوشہ رکھتے ہیں، کو تسلی دی ہے۔

وہ افسانوی شہابِ ثاقب کسی الف لیلیٰ کے جن کی طرح، جیسے کالی آندھی ہو، حضرت عثمانؓ کے دور میں آ کر پوری اُمت کی سوچ پر چھا کر اُسے یرغمال بنا لیتا ہے۔ قرآن کے اِن تمام علماء کی حکمت، تدبیروں، اندازوں اور افہام و اختیارات کو یکسر ایسے ناکام بنا دیتا ہے، جیسے بلب کا کوئی تار باہر کھینچ نکالے۔

اس ڈرامائی جادو کو ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری نے نہایت محققانہ طور پر توڑ کر سراسر جھوٹ کا پلندا قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں سیّد مرتضیٰ عسکری کا تحقیقی کارنامہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

مولوی حامد رضا: پرویز صاحب بڑے پُراُمید ہیں کہ غور و فکر سے اختلافات اور تصادم ختم ہو جائیں گے۔ جبکہ قرآن کی عبارت میں اختلاف نہیں۔

سیّد درویش: کس نے کہا عبارت پر کوئی اختلاف ہے؟ لیکن قرآن فقط عبارت پر مشتمل نہیں۔ قرآن کی آیات، اشارے ہیں۔ سارے اسلام میں جنگوں کی وجہ تفسیر بالرائے ہے۔ دوسرا جب تک غور و فکر کا نقطہ، سفر کی سمت ہی ٹھیک نہیں تو اختلافات کیونکر کم ہوں گے؟ آخری حج پر اکٹھے تھے سارے مسلمان، حضرت ابوبکرؓ کے وقت ہی زکوٰۃ لینے دینے پر خانہ جنگی شروع ہو گئیں۔ کوئی ان سے پوچھے صاحب یہ غور و فکر ابھی

شروع ہونا ہے یا کب مکمل ہوگا/ یا یہ آپ کی خواہش ہے؟

آج زمانۂ مہدی علیہ السلام کے انتظار میں ہے کہ اُنؑ کا ظہور کب ہوگا، جوتلوار سے ظالمین کی صفائی کریں گے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مہدی علیہ السلام تک مجھے ذرا وہ دور دکھا دیجئے جس میں اہل غور وفکر پرویز صاحب کے معیار پر پورے اُترے ہوں اور کوئی نظریاتی کشمکش باقی نہ رہی ہو؟ ماضی میں کب تھا امن کا دور؟ اسلام میں سنہری دور Chiliastic Period ہے۔ اہل کتاب بھی اس ایک امر پر ہم سے متفق ہیں۔ اسلام بلکہ دینِ ابراہیمی علیہ السلام میں تاریخ آگے مہدی علیہ السلام کے ظہور کی طرف چل رہی ہے۔ فلسفہ تاریخ دینِ ابراہیمی علیہ السلام میں مہدویت ہے۔ کسی رفتہ دور یا حکومت کی عظمت مثالی نہیں۔ مثالی زمانہ مہدی علیہ السلام کا ہوگا۔ جب آخر کار مستقبل کے مطابق حال میں ظالمین کے خلاف قیام کرتے کرتے اہلِ عدل اُس زمانہ تک پہنچ جائیں گے۔ یعنی اسلام میں دینِ ابراہیمی علیہ السلام کا تاریخی نقطہ نظر اور مثالی معاشرہ فلسفہ مہدویت Chiliasm پر مشتمل ہے نہ کہ Anachronism پر۔

پرویز صاحب کا یہ امن و اتحاد اُس وقت تک غور وفکر کیلئے دیوانے کا خواب ہی رہے گا جب تک یہ سوچ Goldziher اور Brockelmann کے نظریہ احادیث و قرآن سے آگے نکل کر حدیث میں ثقلین اور احسن الحدیث میں راسخون کو اپنے غور وفکر کا سورج نہیں جان لیتی: ورنہ اپنی اپنی متفرق آراء کی موم بتیاں جلا کر آپ لاکھ جتن کر لیں، صحیح نتیجے پر پہنچ سکتے ہی نہیں۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب غلام احمد پرویز نے سر محمد اقبال کے فلسفۂ خودی اور قرآن کے ساتھ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔ اس کا اسلامی نقطہ نظر سے کیا کردار ہے؟

سیّد درویش: روحِ اسلام کا پرویزی یا اقبالی عشق سے کوئی سروکار نہیں۔ انسان

کیا محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات سے اللہ کو بھی محبت ہے۔ اس لیے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کہہ کر بھی پکارتا ہے۔ جہاں تک ایمان کا تعلق ہے تو اس کا کسی عشقیہ جبلت سے کوئی تعلق نہیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں عشق کا لفظ نازیبا معلوم ہوتا ہے۔ دیکھیں اُمت کا رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تعلق ''اتباع'' اور ''اطاعت'' کا ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ نے کیوں بھیجا؟ اس لیے کہ اُمت عشق کرے؟ بالکل نہیں! نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُمت کے معلّم ربانی ہیں۔ کیا معلم سے عشق کیا جاتا ہے؟ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھیجا کہ وہ ''آیات پڑھ پڑھ کر ہمارے نفسوں کو پاک کرے اور ہمیں تعلیم دے ''الکتاب'' اور ''الحکمۃ'' کی''۔ ٹھیک، معلم نے تعلیم دی۔ اب اس تعلیم کے عوض میں اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُمت سے مانگ کیا رہا ہے، اُجرت! حکم نہیں دے رہا۔ مانگ رہا ہے، دو نہ دو تمہاری مرضی۔ بے شک نہ دینے کی لاکھ دلیلیں اور بہانے بنا لو۔ لیکن وہ اُجرت مانگ رہا ہے، اپنے اہلِ کساء کیلئے ''مؤدت''۔ محبت بھی نہیں بلکہ مؤدت۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جو اُجرت ''مؤدت فی القربیٰ'' بنتی ہے، قرآن کی رُوح سے آپ سیدھی سیدھی ادا کریں۔ یہ ذاتی عشق معشوقی کا تو ذکر، فکر، تقاضا، تک ہی نہیں بنتا۔

مولوی حامد رضا: عشق تو ہو گی جبلت، یہ مؤدت کیا ہے؟

سیّد درویش: عشق کے اُلٹ۔ یعنی ایسی برحق محبت جو عقل کو گمراہ نہ ہونے دے۔ اس مؤدت فی القربیٰ جو اہل مباہلہ والے ہیں، میں ہی نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اتباع ہے۔ بوعلی سیناؒ کا کہنا ہے کہ عشق وہ جنونی حالت ہے جس میں عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔ جبکہ قرآن تو مخاطب ہی عقل والوں سے ہے۔

مولوی حامد رضا: پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ ''وحی انسان کے بلند شعور کو بیدار کرتی ہے۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس کا خدا اور کائنات سے کیا تعلق ہے''۔ پھر کہتے ہیں: ''شیطان نے آدم علیہ السلام کو استدلال سکھایا۔ اُس کو عقل سے روشناس

کروایا۔ ہماری عقل کا دائرہ لاکھ قابلِ احترام سہی، لیکن ادراکِ حقیقت اس کے بس کی چیز نہیں''۔ آگے کہتے ہیں: ''جن اعمال سے خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے، انہیں اعمالِ صالحہ کہا جاتا ہے۔ جن سے اس میں ضعف آتا ہے وہ سیئات ہیں''۔ اس سلسلے میں وہ سراقبال سیالکوٹی کے خطباتی صفحہ 117 سے لکھتے ہیں: ''دنیا میں دکھ پہنچانے والے یا آرام والے اعمال نہیں ہوتے۔ صرف خودی کو مستحکم کرنے والے یا اسے تحلیل Dissolve کرنے والے اعمال ہوتے ہیں۔ یہ اعمال ہی ہیں جن سے اس میں مستقبل کی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ لہٰذا انفرادی بقاء ہمیں بطورِ استحقاق نہیں مل سکتی۔ یہ ذاتی جدوجہد سے حاصل کرنی پڑتی ہے۔ انسان اس کیلئے اُمیدوار ہوتا ہے''۔

سیّد درویش: یہاں ''بلندشعوری'' اور ''ذاتی جدوجہد'' دونوں کا تعلق خودی کے استحکام سے ہے، جس کو عملِ صالحہ کہا گیا ہے، اور اس ہی کو وحی کا مقدمہ قرار دیا گیا ہے انسانیت کیلئے۔ یہ عقل دشمن نظریۂ خودی اصل میں آدم علیہ السلام کے استدلال کو شیطانی قرار دینا چاہ رہا ہے۔

مولوی حامد رضا: ویسے عجیب ہی بات ہے کہ آدم علیہ السلام کو شیطان نے استدلال اور عقل سے شناسائی کروائی! حالانکہ خلیفہ بننے سے پہلے ہی آدم علیہ السلام میں عقل و استدلال تھا، جس کی بناء پر خلافت کا مستحق ملائکہ سامنے قرار دیا۔

سیّد درویش: اصل میں نظریہ خودی اپنی تفویضیت میں کسی استدلال اور عقل کی رکاوٹ کو پسند نہیں کرتا۔ اس کیلئے شعور اور آگہی وہ ہی ہے جو خودی کو تقویت دے۔ یہ استدلال اور عقل کا دشمن ہے۔ اس ابلیسی خودی کی تفویضیت کا نام عشق اور ایمان رکھا ہوا ہے۔ یہ استدلال اور عقل کے از خود بنانے والے مفہوم کو معنی بنائے بیٹھے ہیں۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب آپ استدلال اور عقل کے معنی پر روشنی ڈالیں۔

سیّد درویش: دیکھیں! نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا علم کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتا ہے۔ اُس کو علم عطا

ہوتا ہے، وہ حاصل نہیں کرتا۔ البتہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم وحی کے ذریعے انسانی استدلال اور عقل کو مخاطب کرتا ہے۔ کسی نے حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا کہ عقل کیا اللہ کو جان سکتی ہے؟ فرمایا: ''اللہ وہ نہیں جس کو عقل احاطہ کرے؛ بلکہ وہ ہے جو عقل کو اپنی طرف کشش کرے''۔ کیا مقناطیس لکڑی کھینچ سکتا ہے؟ نہیں! کیوں؟

مولوی حامد رضا: کیونکہ اس لکڑی میں خصوصیت ہی نہیں۔

سیّد درویش: تو خدا، علی علیہ السلام کا اللہ عقل کو اپنی طرف کیوں کھینچ رہا ہے؟

مولوی حامد رضا: کیونکہ عقل میں صلاحیت ہے فولاد کی طرح، یہ بے حس نہیں۔

سیّد درویش: اس عقلی کھچاؤ میں مؤدت نظر آئی؟ کوئی عشقیہ خودسری نہیں۔ بلکہ مقناطیس میں مقناطیسیت راہ گم ہونے دیتی ہی نہیں۔ ایک سمت اور اتباع اس مقناطیسیت کی فطرت میں راسخ ہے۔ اگر عقل ابلیسی ہے تو اللہ نے کیوں کہا کہ اس کی آیات عقلمندوں کیلئے ہیں؟ عقل تو حق کی طرف مؤدت کے فطرتی رشتے میں عقد ہوتی ہے۔ یہ قیاس کرنے والے جو عقل کو ابلیسی کہتے ہیں، کیا جانے کہ عقل کس سعادتِ الٰہی کا نام ہے؟ ان کو کیا کہ عقل کیا ہے اور استدلال کیا ہے۔ عقل ہوتی، تو عقل دشمن کیوں ہوتے؟

آدم علیہ السلام ہمیں عقل و استدلال کی حکمتِ الٰہیہ ہی کی تو تعلیم عملاً دے رہا ہے۔ دیکھیں ہم کسی بھی بات کو سمجھنے کیلئے استدلال کرتے ہیں۔ تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں۔ جُوں ہی استدلال میں کمال آنا شروع ہوتا ہے تو یہ ادراک میں بدلتا جائے گا۔ اب ادراک کا کام یہ ہے کہ Apriori حقائقِ قدیمہ کو دیکھے۔ یہ ہی عقل کہلاتی ہے۔ قیاسِ ابلیسی تو استدلال کی غیر ادراکی، ناکام صورت ہے، کیونکہ اسے اپنی خودی سے باہر حقیقت کو جانتا ہی نہیں۔ خیر اب ادراک میں خودی سے نکل کر حجت کو تلاش کرنا ہے۔ یہ حجت، ادراک اور Apriori ہونے کو سمجھے بغیر دماغی آوارگی اور ذہنی عیاش میں ہی اپنی اعلیٰ ترین فکری

توانائی کا زیاں کرتا رہے گا۔

پرویز صاحب کی حدیث پر تنقید اور قرآن فہمی بس غیر حجت شناس اور عترت کے راسخون ہونے کے منافی ہے۔ اسی سوچ کو جتلانے اور حجتِ راسخون کو قرآن میں جھٹلانے کیلئے وہ Alfred Cobban،Sir James Jeans تو کبھی Einstein کو escapegoat بناتے ہیں۔ ثقلین سے تمسک ختم کرنے کیلئے اقبال، Joad، Sullivan،Bergson اور Huxley کے پُراسرار بین بجاتے ہیں۔

جہاں تک سر اقبال کی ''ذاتی جدوجہد'' کا معاملہ ہے تو آپ جانتے ہیں کہ ابلیس کتنے ہزار سال پوجا پاٹ کی زبردست ذاتی جدوجہد کرتا رہا۔ اُس کی Demoniac Exertion تو ضرب الامثل ہے۔ جب سمت ہی غلط ہو تو سفر منزل سے اُلٹا دور کرتا جائے گا۔ صحیح سمت کا مطلب ہے کہ آدھا سفر ختم ہو گیا۔

مولوی حامد رضا: ایک طرف غلام احمد پرویز کا کہنا ہے کہ ''اسلام میں تکمیل ذات یا انفرادی Development of Self ہے''۔ لیکن ساتھ ہی خودی کو ایثار کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ''یہ بھی شیطان کا کام ہے کہ جوں ہی انسان کے سامنے اجتماعی مفادِ انسانیت کا گوشہ آئے، اس کے ذاتی منافع کو اُبھار کر سامنے رکھ دیا جائے''۔ کیا یہ تضاداتی گفتگو نہیں؟

سیّد درویش: آپ نے Self-development میں چھپی نرگسیت کا دل فریب نعرہ تو سن لیا۔ باقی یہ ایثار والی بات محض شلغموں سے مٹی جھاڑنا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ صاحب نتائج کی بُو سونگھتے ہی ایثار ایثار کے نعرے مارتے بھاگ گئے ہیں۔ شیطان بھی یہ دوہریت دیکھ کر پریشان ہوتا ہو گا کہ ایسے دوستوں کے ہوتے ہوئے دشمنوں کی ضرورت نہیں۔ کوئی ان حضرات کو سمجھائے کہ میاں سارا جھگڑا ہی ''ذاتی منافع'' پر ہے۔ جبکہ انسانیت کی بنیاد ''خود پرستی پر استوار نہیں''۔ تم لوگ جو کہہ رہے ہو،

وہ انسان پسندی ہے۔ انسانیت کا تمہارے کسی اجتماعی فائدے یا نقصان سے کیا سروکار ہوسکتا ہے؟ جس ڈرائیور کو اپنی جان کی پرواہ نہیں، وہ سواریوں سے کیا کرے گا؟ کوئی اس ڈرائیور اور مسافروں کو یہ بھی پوچھے کہ جا کدھر رہے ہو۔ یہ پرویز صاحب کی Utilitarianist معاشرت Sociology تو Epicurean ذات کی ہی بیرونی معاملات میں صُورت تھی۔ باقی سب مذہبی ملمع کاری ہے تفسیر وتشریح کے ذریعے۔ اصل بات میں نے آپ کو بتا دی ہے۔

مولوی حامد رضا: اس دل چسپ موضوع پر ذرا تفصیل سے بحث کیجئے۔

سیّد درویش: (ہنستے ہیں) کیوں مزہ آیا؟ اچھا یہ بتائیں کہ آدم علیہ السلام کو شیطان نے کیا بہکاوا دیا؟

مولوی حامد رضا: لمبی زندگی اور دائمی عیش۔

سیّد درویش: مطلب مستقل جنت۔اور پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اجتماعی جنت۔کیا یہ مبالغہ نہیں؟ ساری گفتگو ہی انسانیت کے نام پر مبالغہ آرائی ہے۔

مولوی حامد رضا: کیسے؟

سیّد درویش: آدم علیہ السلام نے جو ترک الذت کیا، وہ عدل کی گواہی تھا۔ اُس نے حق کیلیئے، معرفتِ حق میں شہادہ دی۔ فرض کریں، ہم نے ذاتی منافع قربان کر دیا اجتماع واسطے، کس لیے؟ جنت ملے گی! جنت تو آدم علیہ السلام نے چھوڑ دی۔ اگر ابلیس کو پتہ ہوتا اللہ کی حکمتِ عملی کا تو اُس نے آدم علیہ السلام کو جنت سے باہر زمین پر آنے ہی نہیں دینا تھا۔ تو ثابت ہوا کہ ذات کا مقدمہ انفرادی ہے نہ ہی اجتماعی نفع یا نقصان برداری میں: یہ تو حق شناسی ہے۔

مولوی حامد رضا: کیا یہ حق شناسی جنت کے منافی ہے؟ اور جنت انفرادی ہے نہ اجتماعی اپنے معیار میں، تو اس طرح جنت کا تصور ہی بے معنی ہو گیا۔

سیّد درویش: آپ تو مولوی صاحب گھبرا ہی گئے ہیں۔ فکر نہ کریں، جنت بے معنی نہیں ہوتی۔ بلکہ جنت کے معنی بدل جاتے ہیں۔ جنت کے معنی بھی عقل میں جوہری حرکت کے مطابق تبدیل ہو جاتے ہیں۔ تو جنت کی بھی تین اقسام ہوئیں: (i) انفرادی (ii) اجتماعی (iii) حق شناسوں کی۔

مولوی حامد رضا: جنت کا مطلب کیا ہوا؟

سیّد درویش: عبادت کے نتیجے میں ملنے والا پھل۔

مولوی حامد رضا: عبادت کیا ہوئی؟

سیّد درویش: اللہ کے حق ہونے کا شعوری مقام۔ یہاں مادی نوعیت کی ثانوی حیثیت رہ جاتی ہے۔ کسی سائل کے جواب میں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: ''عبادت کی ایک قسم ہے ڈر سے؛ دوسری لالچ سے؛ تیسری عین عبادت۔ پہلی غلامی ہے؛ ڈر ختم، عبادت ختم۔ دوسری دوکانداری ہے؛ لالچ ختم، عبادت بھی ختم۔ تیسری عبادت برحق ہے جس میں عقل لائق سامنے سر تسلیم کرلیتی ہے''۔ دیکھا عبادت اور عقل کا کیسا گہرا رشتہ ہے! کس طرح عبادت کا عقلی نقطہ نظر انفرادی یا اجتماعی مقصد کو حق شناسی کے نصب العین میں بدل دیتا ہے! عبادت کا ذاتی مقدمہ عقل کیلئے ''حق شناسی'' ہے۔ جبکہ یہ اجتماعی مفاد پرستی انسانیت نہیں، بلکہ انسان پسندی ہے۔ اس اجتماعی منافع خوری کا انسانیت کے اسلامی نقطہ نظر سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ ویسی ہی باتیں ہیں جس طرح عیسائیت نے مشہور کر رکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام صلح جوئی تھا۔

مولوی حامد رضا: آپ کے نزدیک یہ اجتماعی منافع غیر اسلامی انسان پسندی ہے؛ نہ کہ اسلامی فلسفۂ انسانیت۔

سیّد درویش: جی، کیونکہ یہ غیر معقول ہے۔ ہمارا انفرادی استحکام اور اجتماعی منافع خوری، کوئی ''عمرانی معاہدہ'' بھی کر سکتے ہیں؛ لیکن اس خودغرض معاشرت کی اساس کو

اسلام قرار دینا دراصل آدم علیہ السلام کی حکمت ترک الذت کو ناسمجھنے کے باعث ہے۔ یہ خوداستحکامی کا جو Trojan Standard ہم انسانیت کے قلعے میں انسان دوستی کے نام پر داخل کر کے، عقل کے منافی خودساختہ ایمان کو اساس بنا کر بری الذمہ ہو جانا چاہتے ہیں، اس سے صرف Ambiguous Sociology of Egoism ہی جنم لے گی۔ اور Stuard Mill، Wendell Wilky اور Samuel جیسے ہی اسلام کی تصدیق میں گواہ بن کر سامنے آئیں گے۔ جب قرآن میں صدیقین سے آنکھیں چُرا کر بھاگ جاؤ گے تو پھر امریکہ، جرمنی اور برطانیہ میں ہی جنت کے گواہ ملیں گے۔

روحِ اسلام یہ نہیں ہے کہ خودتفویضی انسانوں کی خوشامد میں اجتماعی مفادات کے اشتراک کو حق کا معیار ٹھہرائے۔ انسانیت کی اس اجتہاداتی تحریف کا اسلام کی حقیقت سے کوئی قرآنی، عقلی، عدلی، روحانی، تہذیبی واسطہ نہیں۔ ابلیس کا یہ غیراسلامی نظریہ ''خود پرستی'' Ipsolatry، تصوف ہو یا فقہ، حدیث ہو یا تفسیر، تاریخ ہو یا ادب، یورپ کی انسان پسند سائنس میں عیاں ہو کر رہ گیا ہے۔ کیا پرویز صاحب کی خودی، ایمان، حُسنِ سیرت اور اعمالِ صالحہ کے لفظوں میں جرمن Romanticism نہیں؟ کیا آپ کو اس ''ذاتی جدوجہد'' میں اٹلی اور جرمن کی انسان پسند اور اصلاحی تحریکیں معلوم نہیں ہوتی؟

مولوی حامد رضا: آپ پرویز صاحب کے اسلام، جدیدیت اور اصلاحی خیالات کو چند الفاظ میں، چند جملوں میں کیسے اظہار کریں گے؟

سیّد درویش: آپ لاکھ جمع تفریق کرلیں، ان کی تمام قلم کاری سے یہ ہی نتیجہ گھوم گھما کر نکلے گا کہ:

He had attempted to divinize Francis Bacon into

his own imperial version of Darwinism. This is his whole construing of Revelation. He had decorated his inconsistent sociology through Islamization of Marx's epicureanism.

مولوی حامد رضا: آپ نے آدم علیہ السلام کے مسئلہِ حقیقت کہ وہ مثالی تھا تمثیلی نہیں، پر بڑی مؤثر بحث کی۔ اب پرویز صاحب کا اصرار یہ ہے کہ فرشتے فطرتی طاقتوں Natural Forces کا ہی تمثیلی نام ہیں۔ اُن کیلئے جنّ بھی شخصی حقیقت نہیں رکھتے، بلکہ غیر مرئی ہوتے ہیں۔ ایسا کہہ لیں کہ وہ غیر مرئی طاقتیں جو قابلِ تسخیر ہوں، فرشتے ہیں اور جو قابو میں لانے دشوار ثابت ہوں، وہ جنات ہیں۔

سیّد درویش: (آپ کے دل میں کوئی خیال آیا اور آپ ہنس پڑے پھر بولے) آپ میرے سامنے بیٹھے نظر آرہے ہیں۔ دوسرے کمرے میں گئے تو غیر مرئی ہو گئے۔ اس کا کیا مطلب ہے کہ آپ جنّ بن گئے؟ مطلب آپ میں مولوی صاحب جن بننے والی طاقت ہے۔

مولوی حامد رضا: (آپ بھی یہ سن کر ہنس پڑے اور بولے:) کیا میں آپ کو جنّ لگتا ہوں؟

سیّد درویش: تو پھر کیا آپ فرشتے ہیں؟

مولوی حامد رضا: کوئی نہیں مانتا۔

سیّد درویش: تو پھر آپ کون ہیں؟ مجھے تو آپ میں کوئی جنّ یا فرشتہ نظر آتا ہے۔ ماشاء اللہ اتنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی اور وہ بھی نورانی سفید۔

مولوی حامد رضا: یقین کیجئے میں باقاعدہ شخص ہوں۔ اس کا مرئی یا غیر مرئی ہونے سے کیا تعلق ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تو قومِ لوط علیہ السلام کی طرف بصورتِ انسانی

ملائکہ کو بھیجا۔

سیّد درویش: یہ ہی تو پریشانی ہے کہ اگر غیر مرئی ہونے سے وجود اپنی شخصی حقیقت یوں کھونے لگا تو اللہ کا اسلامی تصور غائب ہو جائے گا۔ یہ ہی تو مادہ پرست کہتے ہیں کہ ہر سُو کائنات میں مادہ، وقت اور مکاں ہے۔ اگر اللہ شخصی ہے تو غیر مرئی کیوں ہے؟ وہ غیر مرئی شخص اپنی خدائیت میں کہاں، کب اور کس حالت میں ہے؟ وہ ملائکہ اور جنات کی جگہ اللہ کو رکھ کر یہ ہی سوال کہتے ہیں کہ کیوں اس مرئی دنیا میں غیر مرئی طاقتوں کو سمجھنے کی بجائے شخص بنا کر Superstitions and Myths کے دھوکے میں خدا کو پوجتے ہو؟

مولوی حامد رضا: اس لحاظ سے تو مادہ پرستوں کا بھی اعتراض بنتا ہے۔ مطلب یہ کہ پرویز صاحب اس نظریہ تمثیل میں اِن Material Optics کا ادراک نہ رکھتے تھے۔

سیّد درویش: (ہنس کر) اُن کو ادراک سے نفرت تھی۔ اور استدلال اُن کو پسند نہ تھا۔ اچھا خیر یہ بتائیے! آپ حضرت عُزیر کے گدھے کو جانتے ہیں؟

مولوی حامد رضا: (مسکرا کر) میری کون سی اُس سے ذاتی واقفیت ہے۔ ہاں یہ ضرور پتہ ہے کہ وہ بھی حضرت عزیر کے ساتھ مر گیا۔ سو، دو سو سال بعد اُسی جگہ سے اُن کو اللہ نے دوبارہ زندہ کر دیا۔

سیّد درویش: مطلب قیامت سے پہلے حضرت عزیر علیہ السلام نے رجعت فرمائی۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام مرے بغیر آج بھی زندہ ہیں لیکن نظر نہیں آتے حضرت خضر علیہ السلام کی طرح۔ گدھے نے ثابت کر دیا کہ اگر شخص ہو تو غیر مرئی بھی مرئی دنیا میں رجعت کر سکتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ گدھا اجزاء میں تحلیل و فنا ہو گیا۔ Nitrogen اور

Carbon Cycles میں وہ نیست و نابود ہو گیا۔ اب اللہ نے چاہا کہ اُسے زندہ کرے، اُس ہی جگہ سے جس کی مٹی میں اُس کے اجزاء شامل تھے۔ تو اللہ نے قدرتی طاقتوں Natural Forces کو جو مادہ ہی کی توانا جہت ہوتی ہیں، دوبارہ گدھے کی Definitive Form میں متشکل کر دیا۔ تو فطرتی طاقتوں کو نظام عدل میں شخصی حقیقت مل جانے سے نہ ربوبیت پر کوئی اثر پڑا ہے نہ کوئی ظلم برپا ہوتا ہے۔ آج ایک شخص مرئی ہے۔ مر گیا، کل غیر مرئی ہو گیا۔ کیا شخص پر مریت Visibility کے ہونے نہ ہونے سے کوئی منطقی فرق پڑتا ہے؟ نہیں! کیونکہ مریت بالکل اضافی گفتگو ہے، شخصی وجود کے لحاظ سے۔ ہوسکتا ہے جو آپ کیلئے غیر مرئی نہیں، میرے لیے ہے۔ ورنہ آپ قرآن کی تمام آیات کو تمثیل کہہ کر حقیقت سے عاری کر دیں گے۔ یہ تمثیل ہی وہ تقسیمی خط Linea Dividens ہے، اسلامی فلسفے اور غیر اسلامی مغربی سوچوں میں۔ آج مغربی معاشرہ غیر مذہبی طور پر ڈیکارٹ کی خود تفویضی کے راہِ فکر پر گامزن ہو کر غیر روحانی مرض کا سائنسی لقمۂ اجل بن چکا ہے۔

مولوی حامد رضا: میں کچھ کہہ نہیں سکتا، کیونکہ میں نے ابن رُشد کا کبھی اس زاویے سے مطالعہ اور غور و فکر نہیں کیا۔

سیّد درویش: یورپ نے ابن سیناء کی بجائے ابن رُشد کو اپنا لیا۔ جبکہ مسلمان سُنّی دنیا کو حامد غزالی کی متصوفانہ تعلیمات نے فلسفہ اور سائنس کے سورج کو کالے بادلوں کی طرح ڈھانپ دیا۔ مغرب میں خود پسندی نے Avicenna کا فلسفۂ ملکوتی Angeology کو مسترد کر کے ابن رُشد کی ایسی Cosmology اختیار کر لی جس میں عقلیت پسندی Rationalism نے آخر کار کہہ دیا کہ فرشتے تمثیلی افسانے ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ اُن کا عقلی وجود فطرتی طاقتوں کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ سب کچھ ''خود'' انسان ہے۔ علاوہ از انسان ہر شے بے حقیقت اور اس کی غلام ہو گئی۔ انسان

قدرت کی مخفی قوتوں کو اپنی عقل اور تدبیر سے قابو میں لا کر اپنی خدمت میں استعمال کر سکتا ہے۔ مطلب فطرت مارکوٹ اور لوٹ مار پروگرام کے تحت ایک نیا Pleasure-value نظام تشکیل کر لیا گیا۔ سارا نظامِ عدل و ربوبیت اس تمثیلی سوچ نے Desacralize کر کے رکھ دیا۔ اگر Avicenna کی Angeology کو یورپ نے سمجھ کر اختیار کر لیا ہوتا تو یورپ میں گلیلیو، نیوٹن اور ہاکنگ کی بجائے نصرالدین طوسیؒ، جابر بن حیانؒ اور ابوالہیثمؒ پیدا ہونے تھے۔ یہ Anti-angelic سوچ ہی تھی جس نے مغربی Secular Cosmology کو جنم دیا۔ پس ہمیں اسلام کے سائنسی نقطہ نظر کو بنیادی طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے نا کہ غیر مرئی فرشتے اور جنّوں کے خلاف مہم جوئی کرنا۔

مولوی حامد رضا: اس فلسفہ خودی کے فطرت سے یورپ کے جارحانہ رویے کا سدّ باب کرنے کیلئے کیا اسلام میں نظریہ ریاست کارگر ثابت ہوسکتا ہے۔

سیّد درویش: یہ بات یاد رکھیں کہ ساری فساد کی جڑ یہ فلسفہ خودی ہے؛ جس میں خودی اپنے مرکزی کردار میں تمام طاقت کا سرچشمہ خود کو خیال کر کے ہر شے کو فتح کرنے کیلئے حالتِ جنگ میں محسوس کرتی ہے۔ سائنس کی طرح ریاست کیا کر سکتی ہے، اگر وہ جن کی ریاست ہے وہی طاقت کے پیاسے Tolkien کے Orcs ہیں، جس نے ناول The Lord of the Rings لکھا۔ آپ دیکھیں گے کہ Orcs کی جنگ نہ صرف انسانوں کے خلاف تھی، بلکہ وہ ساری فطرت کے دشمن تھے۔ جب طاقت اور توانائی کی Secular Comology نظریۂ حیات اور مقصدِ وجود بن جاتا ہے، تو خودی اپنے اوپر عائد کردہ جھوٹی پابندیوں سے آہستہ آہستہ خود ہی چھٹکارا حاصل کر کے فرشتہ کُش فطرت میں Orc بن کر آخر کار سامنے آ جائے گی۔ کیا آپ کو ایٹمی توانائی اور تباہ کن طاقت والے موجودہ انسان میں Orc نظر نہیں آ رہا؟ تعلیم اس کا بہترین ہتھیار

ہے، فطرت اور انسانیت کے خلاف۔ جب ایک دفعہ دودھ خراب ہو گیا تو پھر اس میں آپ جو بھی ڈال لیں، وہ بھی برباد ہی ہو گا۔

اسی لیے اسلام میں کسی ریاست کا کوئی میعار نہیں۔ کسی طاقت کا Orcian تصور نہیں۔ خواہ وہ علم کا میدان ہو یا سماجی زندگی یا سیاستِ دنیا۔ یہ تو اصل سوال ہی نہیں۔ ریاست آ گئی، ٹھیک! اچھا چلائے گا کون؟ جو چلائے گا اُس کردار پر اسلام کی نظر ہے۔ ریاست ہونا نہ ہونا از خود کوئی معیاری سوال بنتا ہی نہیں۔

یہ ریاست تو یونانی معاشرے میں سیاسی معیار ہوا کرتی تھی۔ جو بعد میں رومن سلطنت میں پھیل گئی۔ پس ریاست غیر اسلامی Graeco-Roman نظریہ سیاست ہے۔ مطلب ایسا نہیں کہ یونانی نظریہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ ہمارا مقدمہ یہ ہے کہ ریاست آلہ ہے۔ اسلام کا مقدمہ آلات سازی نہیں۔ بلکہ کردار سازی ہے جو یہ آلہ چلاتی ہے۔ ایسا بلند کردار جو فلسفہ شہادہ و معرفت کا حامل ہو۔ اگر ریاست بنانا ہی معیار ہوتا تو Confucianism دینِ اوّل قرار پائے۔ جبکہ معیار تو حق شناسی ہے جس میں عقل کو عدل نظر آئے گا۔ ریاست آج ہے کل ختم۔ یہ یونانی ریاست بعد میں یورپی قوم پرستی میں بدل گئی۔ جو فرد اسلام کا فلسفہ عدل و شہادہ سمجھ گیا، وہ اُمت میں شامل ہو گیا، یہ اُمتی کسی ریاست تک محدود نہیں۔ کسی بھی ملک میں موزوں حالات کی تلاش میں رہ سکتا ہے۔ وہ ہر جگہ اعلیٰ، عادل انسان ثابت ہو سکتا ہے۔ اُمتی ہونے کا مطلب ہے کہ فرد شعوری طور پر عالمگیر اُصولِ عدل کا شعور رکھتا ہے؛ جو توحید اور نبوت و امامت سے عدل کی روشنی تاقیامت حاصل کر رہا ہے۔ اُمت ایک Charismatic Community ہوتی ہے۔ اُمت اپنی تاریخی حرکت میں مہدویت کے فلسفہ پر عمل پیرا ہے۔ اُمت حالتِ سفر میں، عدل کے سورج کی طرف منہ کر کے چل رہی ہے جو طلوع ہونے والا ہے۔ اس سفر میں ریاست اگر معاون ہے تو حاصل کر کے ظلم کے

خلاف قیام کرنا برحق ہے۔ اگر ریاست اپنی پرستش پر سفر کو روکنے میں رکاوٹ ہے، تو ہٹا دو۔ بالکل اسی طرح قوم کا مطلب ہے اپنی شناخت کا ذریعہ ہونا۔ قوم پرستی معیار نہیں۔ یہ سب بنا اعلیٰ مقصد بت ہیں۔ اسی لیے حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے: ''ایک غیر اسلامی ریاست جہاں عدل ہو، بہتر ہے، ظالم مسلمان ریاست سے''۔

مولوی حامد رضا: ریاست سے ہی سوال نکلتا ہے کہ یہ دعویٰ کہ اسلام نے تلوار سے جو خلافت قائم کی، اُس نے دینِ حق پھیلایا: کس حد تک جائز ہے؟ آج بھی مسلمان خلافت کی بحالی کیلئے کوشاں ہیں۔

سیّد درویش: ہم یہ بحث کر آئے ہیں کہ دینِ ابراہیمی علیہ السلام میں تاریخ کی سمت ہمیں مہدویت میں نظر آتی ہے۔ مثالی، سنہری زمانہ، مہدی علیہ السلام کا آخری دور ہو گا جب عادل کی تلوار فیصلہ کر کے قیامت تک امن کا قیام کرے گی۔ مطلب پیچھے دیکھنے والا تو کام ہی نہیں۔ ہمیں اپنے زمانہ میں عدل کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔ تاکہ مہدی علیہ السلام کے ساتھ رجعت ہو سکے۔ عزیر علیہ السلام کی رجعت کیلئے مثال ہم دیکھ چکے۔ تو اسلام کے سیاسی نظریے میں مہدویت ہے۔ پس

The Political Theory of Islam like Christianity and Judaism is Chiliastic. There is no Imperial or state cult of Politics for the faithful community.

کوئی اس کو جھٹلانے میں بے شک 200 تھیوریاں بنا لے، الگ بات ہے۔ تو معیار جب ریاست نہیں تو تلوار بھی نہیں، نہ کوئی قلم۔ یہ سب آلات ہیں۔ اگر تلوار اور قلم، حق اور عدل کے ساتھ ہیں تو جائز ہوں گے۔ اگر باطل اور ظلم کے ساتھ ہیں تو ناجائز۔ یہ تلوار کی پوجا، یہ قلم کی پوجا، ظلم ہے۔ اصل بات ہے کہ جس کردار کے ہاتھ میں یہ ہیں اُن کا مقصد کیا ہے؟ کیا وہ خودی کے استحکام واسطے یہ آلات استعمال کر رہا ہے، یا پھر حق کی

شہادہ دے رہا ہے۔ آیا وہ خدا کا نام اپنی خودی کی عظمت کیلئے استعمال کر کے قوم کو بے وقوف تو نہیں بنا رہا؟ منگول اور قدیم امریکی ازتاک بھی کہتے تھے: خدا نے اُن کو ظالموں کے خلاف اپنا نمائندہ چُن لیا ہے۔ علی علیہ السلام کی ذوالفقار میں اسلام کے فلسفہ شہواری کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

میں نے کہا کہ قلم پرستی کا بھی تبلیغ اسلام میں کوئی معیار نہیں۔ میں نے اپنی زندگ میں بڑے مسکین، عاجز اور صاف دل لوگوں کو اَن پڑھ دیکھا ہے۔ دوسری طرف پڑھے لکھے، قلم کے زور سے کھم کھلا ڈاکوؤں کی طرح ہاتھوں ہتھ، دن رات لوٹ ہی لوٹ مچائے بیٹھے ہیں۔ یہ جو آج آپ کو یونیورسٹیاں نظر آتی ہیں، یہ اصل میں دماغی غلاموں کی فیکٹریاں اور منڈیاں ہیں۔ پہلے وقتوں میں پکڑ کر منڈیوں میں غلامی کے تاجر لایا کرتے تھے؛ آج خود سرمایہ دار اداروں میں اپنی فروخت کیلئے چکر لگاتا ہے۔ زنجیریں وہی، انداز بدل گئے؛ زنجیریں سنہری ہوگئیں۔ پہلے چھپ چھپ کر کوٹھوں پر کسب ہوتا تھا، آج جدید ترین علوم سے آراستہ ماڈلنگ نظر آتی ہے۔ ارسطو ٹھیک ہی کہتا تھا: غلامی ختم نہیں ہوسکتی۔ آپ ان کو آزادی دیں، یہ آوارہ ہو جائیں گے۔ شروع سے قلم والوں نے تلوار والوں سے مل کر مقدس نعروں سے سونے و چاندی کے عوض حق، عدل اور اہلِ شعور کا گلہ دبا کر ظلم کو فروغ دیا ہے۔

مولوی حامد رضا: آپ ریاست، تلوار، قلم اور کردار کو اسلام کی زندہ حقیقت میں کیسے مثال بنائیں گے؟

سیّد درویش: اگر کسی کو روحِ اسلام، اسلام میں حق کے معیار کی سمجھ نہیں آتی، یا وہ سمجھنا چاہتا ہی نہیں تو اس میں کیا اسلام کا قصور ہے؟ اسلام پر تنقید سے پہلے کیا آپ نے سمجھ لیا کہ بنواُمیہ ایک طرف وسیع ترین مسلمان سلطنت بنا رہے تھے تو دوسر طرف کربلا کیوں برپا تھی؟ آپ تلوار اور فتوحات کی بیرونی ممالک میں بات کرتے ہیں، لیکن پہلے

جو اندرونی تلوار نے اہل بیت علیہم السلام کو فتح کیا وہ رُوحِ اسلام تھی؟ پہلے آپ کربلا میں قیامت تک شہادہ امام عالی مقام علیہ السلام کو اُموی سلطنت سے ہم آہنگ تو کروا لیں، بعد میں دیکھیں گے کہ تلوار اور قلم کا اسلام میں کیا کردار ہے۔

اب قلم کا حال یہ ہے کہ اسلام نے قوم پرستی کا بُت توڑا ہے۔لیکن ابن خلدون کہتا ہے کہ ''قومی تعصب عظمت کیلئے ضروری ہے۔ کیا آپ ایسے قلم کاروں کو ''موّدت کی زبان'' سمجھا سکتے ہیں؟ اَن پڑھ کا تو پتہ ہوتا ہے کہ اُس کا قصور ہے کہ آنکھیں نہیں۔ اس پڑھے لکھے آنکھوں والے اندھے کو کون دکھائے؟ مذہب تلواروں سے نہیں پھیلتے۔ اگر ایسا ہوتا تو سپین مسلمان ہو جاتا اور بُدھ مت کبھی عیسائیت کی طرح عالمگیر مذہب ثابت نہ ہوتا۔

مولوی حامد رضا: ہماری بحث نے یہ حقیقت عیاں کر دی کہ اسلام میں تفرقے بازی کی بنیاد قرآن اور عترت میں جدائی ڈال کر حدیث ثقلین کو مسترد کرنے نے رکھی ہے۔خودی، قیاس اور اجتہاد نے اپنے اپنے ہم خیال گروہ، یعنی فرقے بنا لیے۔ چنانچہ حدیث کو پرویز صاحب کا وجہ گردانا، اصل میں قرآن کے نام پر تفسیر کر کے خود تفویضی کو چھپانا ہے۔

میرا سوال یہ ہے کہ اگر ہم اس طرح سوچنا اور اختلاف کرنا ہی چھوڑ دیں تو یہ عقل کی حرکت کو جامد نہ کر دے گا؟

سیّد درویش: ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ مکتب اہلِ بیت علیہم السلام میں عقل و عدل اسلام کا عمومی مقدمہ ہے، جو امامت میں صرف مخصوص ہو جاتا ہے۔ عدل کب عقلی طور پر یکسانیت Uniformity کا حامی ہے؟ کسی نے صادق آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث: ''میری اُمت میں اختلاف رحمت ہے'' کیا سچی ہے؟ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ ''تفرقے میں مت پڑو''۔ ذرا غور کیجئے گا کہ ظاہری حدیث اور قرآن

کے اختلاف میں درحقیقت اتفاق، کس طرح راسخون فی العلم بتاتے ہیں۔ فرمایا: ''ہاں! بالکل درست ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کیلئے ایک دوسرے کی طرف سفر کرو''۔

مولوی حامد رضا: سیّد صاحب امام علیہ السلام کے باکمال جملے کو ذرا کشادہ طور پر سامنے لاکر میری سمجھ میں اضافہ کیجئے گا۔

سیّد درویش: عقلی اختلاف اور کشمکش کے دوران سوچ اور رُوح کے تاروں میں جب تناؤ آتا ہے تو فہم وحکمت کے ساز بجنے اور شعور کی آواز نکلنی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر تاروں میں کھچاؤ ہی باقی نہیں تو ان بے جان ڈھیلی تاروں میں روحانی ساز اور فکری آواز کی موت واقع ہو جائے گی۔

فساد فکری اختلاف سے نہیں بلکہ تصادم سے نکلتا ہے جو پیداوار ہوتا ہے اُس سوچ کا جو خود فریبی میں زبردستی یکسانیت کے خواب کی تکمیل اصلاح کے نام پر کرنے کیلئے تُل جاتی ہے۔ ایسی سوچ کا مطلب ہے عقل کا فقدان ہونا؛ جو اگر ہوتی تو اُسے کائنات میں ہرسُو Diversity نظر آنی تھی۔ یہاں تک کہ سائنس بھی جب اپنے دعویٰ میں حتمی Uniformity لانا چاہتی ہے تو خود بخود Wedge of Crisis پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ ہی نظریہ اضافیت کا حقیقت میں سائنسی اعتراف ہے۔ جو دراصل خود بھی Cosmic نہیں بلکہ Mesocosmically محدود نظریہ ہے۔

ہم جب جسم کے صحت مند خلیوں کا بیمار خلیوں سے Histopathological تقابل کرتے ہیں، تو یہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ زندہ، فعال اور تندرست خلیے میں باقاعدہ Division and Diversity of Organelles پائی جاتی ہے۔ لیکن جوں ہی Cell میں بیماری یا موت کے آثار آنے شروع ہوئے، تمام حدود، امتیازات، فرق ختم ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ بالکل خراب انڈے کی مانند۔ حدود ختم ہو کر ایک

دوسرے میں ضم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ کوئی Organelles رہیں گے نہ Membranes۔ سب رنگ ختم؛ بس ایک ہی رنگ رہ جائے گا اور وہ ہوگا بے رنگ، جس کا نام ہے: Necrosis۔ مطلب فرق کی دنیا کو یکسانیت کی کالی آندھی نے اتفاق کے نام پر نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ عدل کا مطلب ہی ہے کہ عقل فرق قائم کرے، تمیز رواں رکھے۔

اتحاد اور ہے، جبکہ یکسانیت اس کے منافی۔ اتحاد تو اکائی کا اتفاق Articulation میں ہونا ہے۔ Ostwald Spengler نے ثقافتوں اور تہذیبوں کے تجزیہ میں اس کیلئے لفظ In-co-Ordination استعمال کیا ہے۔ یہ تو دُکھ اور لذت کے امتزاج میں محبت کو تخلیق کرنا ہے۔ پس Distinction کو Discord، مطلب امتیاز کو فساد سے مت گڈمڈ کرو۔

میں آپ کو فلسفے کی زبان میں سمجھاتا ہوں۔ ایک تو ہے اُصولی وجود Substance، دوسرا ہوتے ہیں ضمنی موجودات Modes۔ اُصولی وجود ایک نقطے کی مانند ہوتا ہے، جبکہ ضمنی مخلوق نقطے کی ہی مختلف Geometric Forms۔ اس کی شاندار تشریح ہمیں Spinoza کی اصطلاحات میں ملتی ہے۔ اوّل الذکر کو وہ Natura Naturans کہتا ہے، دوسروں کو Natura Naturata۔ چنانچہ Modes ایک ہی Substance کو سوچنے کے مختلف پہلو ہوتے ہیں کیا آپ ان Modes کو ''فساد'' کہہ کر انکار یا ردّ کر سکتے ہیں؟

مثلاً ایک اینٹ لیجئے۔ اب اینٹ ایک: لیکن اس کو ہر کوئی ماہر طبیعیات، کیمیادان، انجینئر، مستری، مزدور اپنے اپنے زاویے سے ضرورت اور علم کے مطابق دیکھتا ہے۔ اگر اینٹ کو میں نقطہ فرض کر لوں تو مختلف ماہرین مختلف زاویۂ نظر سے دیکھیں گے۔ اب تفرقہ، فساد کب پیدا ہوتے ہیں؟ تب جب نقطے کی جگہ ہر نظر اپنے اپنے زاویے کو ہی

نقطہ مان کر اتحاد کی بجائے، عدل کے خلاف ظلم میں Articulation نہیں بلکہ Uniformity پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اب بات نکل کر Contra-diction میں چلی جائے گی۔

یہ مصنوعی اتحاد، جوفکری آزادی میں نظریاتی نقطہ کا انکار کرتا ہے؛ دراصل یکسانیت کی ہلاک کن ذہنی آوارگی کا Liberalism میں متشکل ہونا ہے۔ یہ آوارگی ہی ابلیس کی خودفریبی ہے یکسانیت میں، جو اپنے زاویے میں نقطہ سے محروم؛ خود نقطہ نما بن کر نقطے سے منحرف ہو گیا۔ تو نقطے کی جگہ زاویوں کے نقاط بنا لینا ظلم ہے۔ اس کو ہی باطل کہتے ہیں۔ باطل کوئی حق کا قطعی اُلٹ نہیں ہوتا۔ یہ سراب ہوتا ہے۔ مطلب پانی (حق) ہوتا نہیں؛ بلکہ (حق) پانی کا دھوکہ دیتا ہے۔ حق کی بجائے حق نما ہونا باطل ہے۔ پس تفرقہ ظلم ہے۔ جب زاویے بغیر نقطہ، حق کی جگہ نقاط ہونے کے طاغوتی دعویدار بن جائیں۔ حالانکہ عدل تو آزادیِ حق ہے، ہر زاویے میں اہلِ نظر کیلئے نقطے واحدت کو دیکھنے کا۔ اور خود اثباتی اپنے استحکام میں زاویے کا ہی نقطہ کی جگہ لینا ہے۔ وہ نقطہ میں آپ کو ثقلین، صدیقین، راسخون اور وارثان میں دیکھا چکا ہوں: اگر اب بھی چراغ تلے اندھیرا ہے تو اس میں کون سی نئی بات ہو گی؟

مولوی حامد رضا: میرا آخری سوال پرویز صاحب کا یہ کہنا ہے کہ آدم علیہ السلام اللہ ''کا'' خلیفہ نہیں، بلکہ زمین ''پر'' خلیفہ ہے۔ سیّد صاحب مجھے اس ''کا'' اور ''پر'' کا مطلب سمجھا دیجئے۔

سیّد درویش: (ہنستے ہیں) یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان غلام احمد کو آدم علیہ السلام کے نبی علیہ السلام اور خلیفہ ہونے پر کوئی ذاتی غصہ تھا، جیسے ایک دوسرے غلام احمد کو عیسیٰ علیہ السلام کے حضرت ہونے پہ۔ اچھا ان صاحب کو کس نے کہہ دیا کہ وہ زمین پر خلیفہ نہ تھے۔ لیکن وہ زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجے گئے؛ دوسرا اللہ کی طرف سے۔ بس اتنی ہی

بات ہے۔ آپ تخلیق سے قبل ہی خلیفہ تھے۔ اگر رسول علیہ السلام، اللہ کی جانب سے بھیجا جانے والا رسول اللہ ہوسکتا ہے، تو آدم علیہ السلام اللہ کا خلیفۃ اللہ نہیں ہوگا؟ خلیفہ اپنی اعلیٰ صفات میں اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے، حریف نہیں۔ نمائندہ وہ جس کو حاکم اعلیٰ اپنا خلیفہ مقرر کرے۔ کیا سجدے نے کوئی شک باقی چھوڑا کہ اُس میں اللہ نے ''اپنی'' الروح پھونک دی تھی۔ کسی فرشتے، جن، انسان میں نہیں بلکہ نبی علیہ السلام میں۔ تو آدم علیہ السلام کو سجدہ، اللہ کو سجدہ۔ ابلیس بھاگ گیا، بھگوڑا ہو گیا۔ تو آدم علیہ السلام میں جانشینی کیلئے وہ الروح تھی جس نے اُس کو مسجودِ ملائکہ ثابت کر دیا اور ابلیس رجیم ہو گیا۔ تو آدم علیہ السلام اللہ کی طرف سے ہی نہ صرف خلیفہ ہے بلکہ اُس میں اللہ کی الروح ہے! تو جیسے عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ کہلاتے ہیں! جیسے عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا نبی، ویسے آدم علیہ السلام، اللہ کا خلیفہ! آدم علیہ السلام نے عملی طور پر اللہ کی تعلیم کو اپنے کردار میں ہدایتِ انسانی کیلئے تبلیغ کیا۔

مولوی حامد رضا: کیا رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا بھی خلیفہ ہوتا ہے؟

سیّد درویش: دیکھو خلیفہ صرف اللہ کا ہوتا ہے۔ نبی علیہ السلام اللہ کی طرف سے صرف اعلان کرسکتا ہے۔ اپنی مرضی سے، بنا اُذنِ الٰہی اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خلیفہ نہیں بنا سکتا، تو میں اور آپ جیسے کُجا!

اس کے بعد امداد علی نے کہا کہ سیّد درویش بولے: بہتر ہے کہ یہاں پر سلسلۂ گفتگو اختتام پذیر ہو جائے۔ تا کہ رُوح کو غور وفکر کیلئے جتنی غذا میسر ہوسکی ہے وہ ہی اچھی طرح ہضم ہو جائے۔ اللہ نے چاہا تو پھر کبھی معرفتِ الٰہیہ پر بات ہو گی۔ اُمید ہے آپ میں بھی برداشت پیدا ہو چکی ہو گی اور میں بھی مزید بہتر الفاظ میں اظہار کے لائق ہو جاؤں گا۔

فی الحال میں نے آپ کو پھولوں کی جو قلمیں دی ہیں: آپ عقل ومحبت کے باغ

ان سے بھی لگا، بڑھا اور سجا سکتے ہیں، عصمتِ انبیاء علیہم السلام کی خوشبو کو پھیلانے کیلئے!

والسلام

14-12-2019

کتابیات

1- قرآن۔ مترجم سیّد فرمان علی

2- تفسیر قمی

3- تفسیر فرات

4- تفسیر ابو حمزہ الثمالی

5- تفسیر نمونہ

6- عیون اخبار الرضا

7- عصمت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ سیّد حشمت حسین جعفری

8- ابلیس و آدم۔ غلام احمد پرویز

9- مقامِ حدیث۔ غلام احمد پرویز

10- Islam A Challenge to Religion۔ غلام احمد پرویز

Other writtings of the author are available on:

(i) academia.edu

(ii) urdu-book.com

(iii) Islamicoshia.wordpress.com